

QASID KITAB GHAR
Mohammad Hanif Razvi Nagarchi
Near Jamia Masjid, Arcot Dargah,
BIJAPUR-586104, (Karnataka)

بیجاپور کا ایک صوفی شاعر

شادِ مرعظم



ڈاکٹر حسینی شاہد



انجمن ترقی اردو، آئندھرا پردیش

QASID KITAB GHAR
Mohammad Hanif Razvi Nagarchi
Near Jamia Masjid, Arcot Dargah,
BIJAPUR-586104, (Karnataka)

حیدرآباد

بیجاپور کا ایک صوفی شاعر

محمد حنیف صوفی نگارچی
بسیالی گور

شاہ معظم

ڈاکٹر حسینی شاہد

○

انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش

حیدر آباد

QASID KITAB GHAR
Mohammad Hanif Razvi Nagarchi
Near Jamia Masjid, Arcot Dargah,
BIJAPUR-586104, (Karnataka)

تحریک فکر اہل سنت

Tahreeke Fikre Ahlesunnat

اشاعت دسمبر ۱۹۷۸ء
 مطبع دائرہ پریس، چھتر بازار،
 خوش نویس محمد عارف الدین
 ناشر انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش
 قیمت ~~۲۰~~

QASID KITAB GHAR
 Mohammad Hanif Razvi Nagarchi
 Near Jamia Masjid, Arcot Dargah,
 BIJAPUR-586104, (Karnataka)

ملنے کا پتا

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش، حمایت نگر، حیدرآباد
 اردو اکیڈمی آندھرا پردیش
 ایسٹ ٹریڈرز، شاہ علی بندہ روڈ
 انجمن ترقی اردو، ہند، راویا وینو، نئی دہلی
 مکتبہ جامعہ، اردو بازار، نئی دہلی
 مکتبہ جامعہ، شمشاد مارکٹ، علی گڑھ۔

فہرس

- شاہ معظم کے بارے میں — ۵
 تصانیف،
 قصیدہ — ۱۱
 گفتار عقل و عشق — ۲۷
 سوال صادق و جواب معظم — ۳۵
 سی حرفی — ۴۶
 معراج نامہ — ۶۳
 ساقی نامہ — ۷۳
 مفتاح الاسرار — ۹۶
 آزاد نامہ — ۱۰۹
 گلزارِ چشت — ۱۲۹
 شجرۃ الانقیاء — ۱۴۳
 دیوانِ معظم — ۱۷۸
 شرح شکار نامہ — ۲۰۸
 منویات و مشتبہات
 مشنوبی — ۲۱۴
 وجود العارفین — ۲۲۳

QASID KITAB GHAR

Mohammad Hanif Razvi Nagarchi
 Near Jamia Masjid, Arcot Dargah,
 BIJAPUR-586104, (Karnataka)

یہ کتاب اردو اکیڈمی آنیہرا پردیش کی مالی اعانت سے شائع کی جا رہی ہے

مصنف کی دوسری کتابیں

امریجون

سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ — حیات اور کارنامے

زیر طبع :

اردو نثر کا پہلا مستند نقش

میراں جی خدا نا

شاہ محمد قادری نور دوریا

QASID KITAB GHAR

Mohammad Hanif Razvi Nagarchi

Near Jamia Masjid, Arcot Dargah,

BIJAPUR-586104, (Karnataka)

سید ہاشم خداوند ہادی

متروک اصناف سخن

شاہ معظم، علی عادل شاہ ثانی شاہی (۱۰۶۷ - ۱۰۸۳ ہجری) کے دور کے ایک صوفی شاعر تھے۔ انھوں نے سکندر عادل شاہ (۱۰۸۳ - ۱۰۹۷ ہجری) اور اورنگ زیب کا زمانہ (۱۱۱۸ ہجری) بھی دیکھا ہے۔ عادل شاہی سلطنت نے ان کی نظروں کے سامنے آخری پہچلی لی اور دارالسرور بیجاپور کا سہاگ لٹ گیا۔ نضرتی کے الفاظ میں بدو بد جنس کے منصوبے کامیاب ہوئے اور علم و فن، تہذیب و شائستگی، دکھنی زبان و ادب اور ہندو لمانیت کے ایک عظیم مرکز کی اینٹ سے اینٹ بن گئی۔ شاہ معظم اس المیے پر آنسو بہانے کے لیے زندہ رہے اور جب تک زندہ رہے، شاہ پور کے تفسیفی فیضان کو عام کرتے رہے۔

شاہ معظم، شعراے حلقہ امینیہ کے گل سرسبد ہیں۔ انھوں نے دیوان غزلیات کے علاوہ، متعدد مثنویاں اور متفرق کلام، جن میں منقبت، مدح، قصاید وغیرہ شامل ہیں، یادگار چھوڑا ہے۔ ان کی مثنویوں اور دیوان کے نسخے کتب خانوں اور خانگی ذخیروں میں عام طور پر مل جاتے ہیں، جس سے ان کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن تعجب ہے کہ اس کے باوجود ان کے حالات اور خاندان کے بارے میں ہم تک کوئی معلومات نہیں پہنچ سکی ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ان کے پورے نام سے بھی واقف

رہے، صرف تخلص سے متعارف تھے۔

شاہ معظم کے کلام کے تفصیلی مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ معظم اُن کا لقب ہے اور عطا کے پیر:

خود قادر پیار کیا ہے : مجھ رویت آپ دیا ہے
مجھ را کھا ناؤں معظم : اور اپنا کیتا محرم
(مفتاح الاسرار)

میرا معظم ناؤں رکھ، عالم پوویں ظاہر کیا
قادر بڑا داتا رہے پھر کیا کرے گا دیکھنا
(دیوان)

قادر ہے نام شہ کا، کیا اسم ہے مسی
کر مجھ کو بیچ ہزاری معظم دیا لقب

(دیوان)

کہیں کہیں وہ اپنے آپ کو سلطان معظم بھی کہتے ہیں،
یو نامہ کیا کر مجھے حق دیا : مجھ عاجز کو سلطان معظم کیا

(معراج نامہ)

اپ تاج فقر کا دیتا : اور سلطان معظم کیتا
(مفتاح الاسرار)

غالباً ان کا پورا لقب سلطان معظم ہے۔

شاہ معظم کی شرح شکار نامہ کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ: ان کا نام محمد حسینی ہے، وہ قادری تھے، چشتیہ گھرانے

میں طالب ہوئے اور حضرت امین کے تربیت یافتہ تھے۔

اس شکار نامے کی شرح فقیر محمد حسینی معظم قادری اپنے حوصلے موافق فرما
ہیں، اس واسطے کہ یو عاجز اس گھر چشت میں طالب ہوا ہے، ہور
امین الدین علی خود کوں سمجھہ کیا ہے، اون کے تصدیق سوں یو فقیر اس راز
کوں پونچا ہے بلکہ

اپنی نسبت قادریہ کی طرف انھوں نے گلزار چشت میں بھی اشارہ کیا ہے،
معظم کتے قادری ہے فقیر : گناہ گار، عاجز، فقیر و حقیر

لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ خانوادہ قادریہ میں وہ کس سے بیعت تھے۔ اس بارے میں ذق
خود انھوں نے کچھ کہا ہے اور کوئی داخلی یا خارجی شہادت ہی ایسی ملی ہے جس کی
بنیاد پر ہم کوئی رائے قائم کر سکیں۔ البتہ چشتیہ گھرانے میں بیعت اور اپنے پیسہ اور
دادا پیر کا ذکر واضح الفاظ میں کی جگہ گیا ہے، لیکن اس کے باوجود اہل تحقیق کے بیانات
میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعضوں نے انھیں حضرت امین الدین علی اعظمی کا اور بعضوں
نے حضرت امین کے خلیفہ حضرت عبدالقادر لنگ بندہ (قادر لنگا) کا مرید و شاگرد
بتایا ہے۔ بعضوں کے بیانات متناقض اور متضاد ہیں بلکہ

۱۔ مخطوط نمبر (۲۱۱۷) کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد

۲۔ ڈاکٹر رفیع سلطانہ، اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء، صفحہ ۱۹۲۔ البوہار زبانی، قدیم لہجہ و لہجہ اول، صفحہ ۲۱۲

۳۔ سخاوت ہزارا، تاریخ ادب اردو، جلد اول، صفحہ ۴۷۸

۴۔ ڈاکٹر ذرورہ فہرست مخطوطات ادارہ ادبیات اردو، جلد اول، صفحہ ۱۳۸ اور صفحہ ۲۶۵، دکنی ادب

۵۔ کی تاریخ، صفحہ ۶۰

نہج الدین محمد شمس کتب خانہ ذاب سارا جنگ کی اردو نقلی کتابوں کی وضاحتی فہرست صفحہ ۱۹۹،

اردو صفحہ ۳۸۳، فہرست مخطوطات کتب خانہ آصفیہ، جلد دوم، صفحہ ۲۹۰، دکن میں اردو

چشمی اشاعت، صفحہ ۲۶۹، علی گڑھ تاریخ ادب اردو صفحہ ۳۲۱

دل برسوں مل معظم عشرت مدام کو تو ۛ قادر ترا سنگاتی تیرے سنگات ہے لگ
(دیوان)

ایک شعر میں صاف الفاظ میں اپنے پیر کا نام قادر بتایا ہے :
جگوں مدد ہے پیر کا جس نام ہے قادر کتے

تب یو معظم جگ منے مشہور یوں اظہر ہوا

(دیوان)

شاہ معظم نے اپنی روحانی سرگزشت مفتاح الاسرار میں بیان کی ہے۔ جو غالباً
ابونصر خالدی اور دوسرے محققین کی نظر سے نہیں گزری۔ اس مثنوی میں معظم نے بتایا
ہے کہ حکم نبی کی متابعت میں وہ حضرت امین کے طالب ہوئے :

اب جا تو بیجا پور ۛ ہے پور وہاں شہ پور

دھال امین علی ہے پیر ۛ ہے روشن دیکھ ضمیر

اب ہونا جا کر طالب ۛ گر عشق تجھے ہے غالب

میں کیتا امر قبول ۛ جوں بولے نبی رسول

حضرت امین نے اوامر و نواہی سے واقف اور امرا و رموز سے باخبر کرانے
کے بعد شاہ معظم سے کہا کہ تیرا پیر تو قادر ہے، تو اُس کو اپنے دل میں بسالے اور
اس کا دامن تھام لے :

ہے پیر ترا تو قادر ۛ او حاضر ہے تو ناظر

اوس پیر کو نامیں بسر تو ۛ اور اس کو دل میں دھر تو

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ معظم کے پیر قادر لنگا تھے اور انھوں
نے اپنے دادا پیر یعنی حضرت امین الدین علی اعلیٰ سے بھی کسب فیض کیا ہے۔

شاہ معظم نے حضرت امین، اُن کے بیٹے بابا شاہ حسین اور پوتے علی پیر کا
ابتدائی زمانہ دیکھا ہے۔ شجرۃ الاتقیاء انھوں نے علی پیر کے زمانہ سجادگی ہی میں لکھی

ابونصر خالدی صاحب نے قیاس آرائی کی ہے کہ شاہ معظم کے مرشد
بیعت تو امین الدین اعلیٰ ہی تھے اور قادر مرشد تربیت، جنھوں نے امین الدین کے
حکم پر معظم کے مراتب سلوک و مدارج معرفت اپنی نگرانی میں طے کرائے بلکہ
حقیقت اس کے برعکس ہے۔

شاہ معظم، حضرت قادر لنگا کے مرید تھے اور اپنے پیر سے دیوانہ وار عقیدت
رکھتے تھے۔ انھوں نے کم و بیش ہر مثنوی اور نظم میں بلکہ ہر غزل کے مقطعے میں اپنے
پیر کا ذکر کیا ہے اور بڑے مان سے کیا ہے۔ بعض غزلوں اور رباعیوں میں تو وہ والہانہ
شیفتگی، ربودگی اور سپردگی ملتی ہے، جو صرف مجاز کے لیے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔
ہوا تر لوک پر غوغا کہ ثانی آئیا یوسف

نویلا لال قادر شاہ معورت لے سب پیہر کا

(قصیدہ)

جہ عقل کہتی اٹھ معظم کام کر ۛ اور عشق کہتا قادر سے مل آرام کر

(گفتار)

وہ قادر انوکا تو ساقی کتے ۛ پلاتا ہے مے بھر کے باقی کتے

(آزاد نامہ)

بزرگی اسم اعظم کی کیا قران میں لیکن

معظم کو درو کر نے سو قادر نام خوش لگتا

(دیوان)

ادب شاہ خواہاں قادر ہے نام اوس کا ۛ خلعت عطا کرے گاسن کہ کلام میرا

(دیوان)

تھی۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ وہ بارہویں صدی کے دوسرے بلکہ تیسرے دہے کے
اوایل میں بقید حیات تھے۔

نصیر الدین ہاشمی کا بیان ہے کہ شاہ معظم "امین الدین اعلیٰ کے مرید اور خلیفہ تھے۔
لیکن کسی ذریعے سے اس کی توثیق نہیں ہوتی کہ انھیں قادر لنگا یا حضرت امین سے خلافت
حاصل تھی۔ یہ مفروضہ ہے کہ اُن کے علمی تبحر اور کمال فن کے پیش نظر قیاس کہتا ہے کہ
انھیں خلافت حاصل ہوگی، لیکن محض قیاس کی بنیاد پر کوئی نتیجہ اخذ کرنا تحقیقی احتیاط کے
منافی ہے۔ تاہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ جہاں تک فیضان تصنیف
کا تعلق ہے، وہ حضرت امین کے حلقہ ارادت میں امتیازی مقام رکھتے ہیں، بلکہ یہ کہا
جاسکتا ہے کہ حلقہ امینیہ کے تصنیف و تالیف کے کارناموں کا کوئی تذکرہ اس وقت
تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ شاہ معظم کی خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے۔

قصیدہ

شاہ معظم کا یہ قصیدہ اُن کے دیوان کے علاوہ کتب خانہ نواب سالار جنگ کے اُس
مجموعے (۱۲۹ تصوف) میں بھی ملتا ہے، جو آزاد نامے، الف نامے (شاہ معظم)
اور وصیت الہادی (شاہ برہان الدین جانم) پر مشتمل ہے۔ انھیں دو نسخوں کا مقابلہ کر کے
ابونصر خالدی صاحب نے اس کا متن رسالہ قدیم اردو، جلد اول، میں شائع کیا تھا۔
مجموعہ رسائل (۱۲۹ تصوف) میں پہلے آزاد نامہ ہے اور اس کے بعد زیر تبصرہ قصیدہ
جو دو صفحات اور اکیس ابیات پر مشتمل ہے۔ قصیدہ، سرخ روشنائی سے لکھا ہے۔
کوئی ترتیب نہیں ہے۔

دیوان میں یہ قصیدہ ردیف الف کی غزلوں میں شامل ہے اور غزل کی سرفنی کے
تحت لکھا گیا ہے۔ تعداد اشعار بائیس ہے۔

خالدی صاحب نے اس قصیدے کے تمہیدی نوٹ میں جو کچھ لکھا ہے، وہ اتنا عمومی
ہے کہ اُس کو تصوف کے کسی رسالے سے بھی متعلق کیا جاسکتا ہے۔ اس عمومیت کی وجہ
سوائے اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ خالدی صاحب نے اُن اصطلاحات کو سمجھنے اور
سمجھانے کی ضرورت اور اہمیت محسوس نہیں کی، جو اس قصیدے میں استعمال ہوئی ہیں
جہاں چہ وہ لکھتے ہیں:

راقم الحروف کا خیال ہے کہ اس قصیدے کے موجودہ قاریوں میں شاید ہی کوئی ایسے بزرگ نکلیں جو تصوف کو اس کے ذریعے سمجھنا چاہیں۔ اس حسن ظن یا سوء ظن کی وجہ سے قصیدے میں آئی ہوئی اصطلاحوں کی تشریح ضروری نہیں معلوم ہوتی۔ جہاں جہاں قرآنی آیتوں کا ذکر آیا ہے، اُن کے مکمل حوالے درج کر دیے گئے ہیں اور اگر بعض فرض محال کسی صاحب کو اس قصیدہ میں بیان شدہ تصوف سے دل چسپی ہو اور وہ اس میں آئی ہوئی اصطلاحوں کے معنی متعین کرنا چاہیں تو وہ معظم سے قریب تر زمانے کے ایک بزرگ محمد حیات متوفی بارہ سو اکاسی ہجری کے رسالوں سے رجوع کر سکتے ہیں جو اردو (دکنی) میں لکھے گئے ہیں۔ اُن کے بانیس رسالے مصباح الحیات کے نام سے کئی مرتبہ چھپے ہیں۔

دکنی تصوف کے رسائل ہمارے ہاں درس و تدریس کے کام آتے رہے ہیں، مثلاً من لکن ایک گھرانے میں داخل نصاب تھی اور اس کو سبقاً سبقاً پڑھا اور پڑھایا جاتا رہا ہے اس لیے اگر کوئی شاہ معظم یا اُن کے سلسلے کے بزرگوں کی تصانیف سے تصوف سیکھنا چاہے تو یہ حیرت کی بات نہیں ہوگی۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ خاندانہ امینیہ کے تصوف کا جائزہ لیا جائے تو ہندو ملانیت کی اس عہدِ آفریں تحریک کے بڑے ہی معنی خیز، دل چسپ اور گہرے نقش اباگر ہوں گے جو مسلمانوں کے ہندوستان میں بس جانے کے بعد شروع ہوئی اور جس نے ہندوستان کے ذہن اور اس کی تہذیب ہی کا نقشہ انہیں بدلا بلکہ مذہب کے اعلیٰ تصورات کو بھی متاثر کیا۔ یہ اثر اندازی اور اثر پذیری دو طرفہ تھی۔ اس لیے اس دبستانِ تصوف کا مطالعہ دکنی زبان اور ادب کے طالب علموں کے لیے ہی نہیں بلکہ اُن لوگوں کے لیے بھی ضروری ہے جو قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی فکر اور

تہذیب کی تاریخ سے دل چسپی رکھتے ہیں۔

دکنی ادب کے محققین صوفیانہ ادب کا مطالعہ اُن کی لسانی اہمیت کے پیش نظر کرتے ہیں۔ اس لیے اگر اصطلاحوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر کرم خوردہ رسائل کے مطالعے اور اُن کو مرتب کرنے کے لیے آنکھیں پھوڑنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ عجیب بات ہے کہ خالدي صاحب نے قرآنی آیتوں کے مکمل حوالوں کو درج کرنا تو ضروری سمجھا، لیکن تصوف کی اصطلاحوں کو نظر انداز کر گئے۔ اگر موجودہ قاریوں میں کوئی بزرگ ان رسائل کے ذریعے تصوف سیکھنا نہیں چاہتے تو کون بزرگ اس رسالے میں نقل کی گئی آیات کی قرآن کے متن سے مطابقت و تصدیق کی ضرورت محسوس کریں گے۔ اس لیے جس دلیل کی بنیاد پر اُنھوں نے اصطلاحات کی تشریح کو غیر ضروری بتایا ہے، اسی دلیل کی بنیاد پر قرآنی آیات کے حوالوں کو بھی غیر ضروری رحمت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ قرآنی آیات کے حوالے تو آسانی سے مل جاتے ہیں لیکن ان اصطلاحات کی تشریح کہیں نہیں ملتی جو معظم اور ان کے سلسلے کے دوسرے بزرگوں نے استعمال کی ہیں۔ اس لیے قرآنی آیات کے حوالوں سے زیادہ ان اصطلاحات کی وضاحت کی ضرورت تھی، بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کی وضاحت کے بغیر دکنی تصوف کے کسی رسالے کا مرتب کرنا بے معنی ہوگا۔

خالدي صاحب نے اُن بزرگوں کو جو بہ فرض محال معظم کی اصطلاحوں کے معنی متعین کرنا چاہتے ہیں، محمد حیات کے مجموعہ رسائل، مصباح الحیات کے مطالعے کا مشورہ دیا ہے۔ یہ مجموعہ بانیس رسائل اور ۶۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک رسالہ آب حیات کے نام سے ملتا ہے، جس میں حروفِ تہجی کی ترتیب سے اصطلاحاتِ تصوف کی تشریح کی گئی ہے۔ خالدي صاحب نے غالباً اسی رسالے سے استفادے کا مشورہ دیا ہے۔

۱۔ راقم الحروف کے پیش نظر مصباح الحیات کا وہ ادیشن ہے جو ہمدرد بکٹریو، نیوارکٹ، نیگور سے شائع ہوا ہے۔

لیکن خانوادہ امینیہ کی مخصوص اصطلاحوں میں سے کوئی اصطلاح نہ تو اس رسالے میں ملتی ہے اور نہ دوسرے رسائل میں۔

ہر حال عجیب و غریب تاویلات کر کے خالدی صاحب نے اصطلاحات سے پیچھا چھڑا یا ہے اور کج معنی (آزاد نامے) کے خاتمے پر جو چند اصطلاحوں کو کھولنے کی کوشش کی ہے تو ان کی حیثیت ایجاد بندہ کی ہوگئی ہے۔ مثلاً: چار وجودوں، سات مستیوں، چھ غفلتوں، پانچ جوہروں۔ پانچ موزیوں کی جو تشریح انھوں نے کی ہے، معظم کے تصوف سے اس کا کوئی علاقتہ نہیں ہے۔

خالدی صاحب کی رائے میں قصیدے کی نمایاں خصوصیت، اس کا ایجاز، اختصار اور جامعیت ہے، لیکن اس ایجاز و اختصار کا یہ حال ہے کہ معظم نے کسی مرتبے کا نام لیا ہے، نہ اُن کے موکل، روح، قلب، نفس، فہم، توحید، راہ، ذکر اور منزل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ نہ اسرار و رموز، کیفیات و واردات بیان کیے ہیں، نہ عروج و نزول سمجھا یا ہے۔ صرف تنوں (وجودوں) مقاموں اور منزلوں کی تعداد گنا دی ہے اور مراتب کے ذکر کے بغیر سالک کے وہ نام بتا دیے ہیں جو اُسے ہر مرتبے میں بہ اعتبار حال حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح نفس، دل، روح، سر، نور اور ذات کی اصطلاحوں کو ایک ہی سانس میں گنا دیا ہے۔

حضرت ابن واجب تن کے ضمن میں پانچ عناصر، پچیس گن اور اُن کے لوازمات کی تشریح کرتے ہیں اور اسی ضمن میں انسان کی صفات ستوہ اور صفات مذمومہ اور بعض دوسری چیزوں کو کبھی تشبیہ اور استعارے کے انداز میں اور کبھی سیدھے سادے طریقے پر بیان کرتے ہیں۔ پانچ موزیوں، پانچ لعلوں، پانچ چوروں، سات مستیوں اور چھ غفلتوں کی تفہیم بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ معظم نے نہ تو مرتبے کا ذکر کیا ہے، نہ عناصر اور اُن کے گنوں کا۔ بلکہ موزیوں، غفلتوں اور مستیوں کی طرف اچھٹا سا اشارہ

کیا ہے۔ کچھ اور سائل بھی اس ضمن میں آگے ہیں، اُن کی طرف بھی محض اشارے ہیں۔ مختصر یہ کہ شاہ معظم نے اس قصیدے میں اپنے سلوک کا خاکہ پیش کیا ہے اور نہ اس کے شرائط اور لوازم بیان کیے ہیں بلکہ اس کے بعض پہلوؤں کی طرف کسی ربط و تسلسل کے بغیر سرسری اشارے کیے ہیں اور اُن کا تعلق بھی تمام مراتب سے نہیں ہے۔

شاہ معظم اپنی دوسری منظومات میں بھی تعلیمات کی تفصیل نہیں بیان کرتے بلکہ اشاروں اور کنایوں سے کام لیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت امین اور اُن کے خانوادے کے بزرگوں نے اپنی تعلیمات کو اس قدر شرح و بسط اور تشریح و تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے کہ معظم نے ان کی تکرار کو غیر ضروری سمجھا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ معظم کے شاعرانہ شعور نے نظام و نہاب تصوف کی پیچیدگیوں میں الجھنا، خشک اور غریب چسپ تفصیلات میں سرگرداں ہونا اور جزئیات کی اکتا دینے والی تکرار کو گوارا نہ کیا ہو، بلکہ اُن کی طرف سرسری اشارے کر کے اُس کیفیت کی باز آفرینی پر توجہ دی، جو اس پورے نظام کا حاصل ہے۔ اس اہتمام کا نتیجہ اُن کا وہ ایامی اسلوب ہے جو انھیں اپنے سلسلے کے دوسرے صوفی شاعروں سے ممتاز کرتا ہے، لیکن زیر نظر قصیدے میں اس ایامی اسلوب کی بلاغت اور دلچسپی کا بھی فقدان ہے۔ قصیدے کی کل بضاعت باتیں آیات ہیں اور ان باتیں آیات میں سلوک بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ پوری نظم اصطلاحات سے بوجھل اور اشارات کی وجہ سے مبہم اور غریب چسپ بن کر رہ گئی ہے اور وہی ایجاز و اختصار جو اُن کی دوسری منظومات کا حسن ہے، اس قصیدے میں عیب بن کر بری طرح کھٹکتا ہے۔

ایک اور عیب یہ ہے کہ اشعار میں ربط اور تسلسل ہر جگہ برقرار نہیں رہ سکا ہے جس کی وجہ سے غزل کا انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ اس لیے اس کو قصیدے کی بجائے

غزل کہنا زیادہ مناسب ہے اور دیوان میں ردیف الف کی غزلوں ہی میں شامل ہے،
خالدی صاحب کا خیال ہے کہ:

معظم نے اپنے پیر بھائیوں کے لیے اپنے سلسلے کی تعلیم کا ایک محل،
لیکن جامع خلاصہ منظوم کر دیا ہے تاکہ جو لوگ تفصیلات میں پڑے بغیر تعلیم
و طریقہ تعلیم سے واقف ہونا چاہیں، وہ اس قصیدے پر ایک نظر ڈال لیں
اور راہ سلوک طے کرنے کا ارادہ کرنے والے مبتدی اس کو حفظ کر لیں۔

جہاں تک حفظ کرنے کی تجویز کا تعلق ہے مبتدی اور منتہی دونوں حفظ کر سکتے ہیں
لیکن اس قصیدے کو حفظ کر کے مبتدی کے لیے راہ سلوک طے کرنا اور تفصیلات سے
گہری واقفیت کے بغیر صرف اس پر ایک نظر ڈال کر پوری تعلیم و طریقہ تعلیم سے واقف
ہونا ممکن نہیں۔ اس لیے کہ قصیدے کے اجمال (اگر اس کو اجمال کہا جاسکتا ہے) اور
اشاروں کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو تفصیل سے کماحقہ واقف ہے، اور یہ تفصیل معظم
کی کسی نظم میں نہیں ملتی۔ اس سے واقفیت کے لیے اُن کے دادا پیر حضرت امین کی
قصائیف کا مطالعہ ضروری ہے، جن میں انھوں نے اپنے نظام تصوف، اس کی ساری
تفصیلات اور تمام جزئیات کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اُن کے سلسلے
کے دوسرے اربابِ رشد نے ان تعلیمات کو منتر کی طرح دہرایا ہے۔ معظم اور اس
سلسلے کے دوسرے بزرگوں میں یہی فرق ہے کہ معظم تفصیل میں نہیں جاتے اور ان
بزرگوں کے ہاں صرف تفصیل ملتی ہے۔ اس لیے کہ معظم شاعر ہیں اور وہ اربابِ رشد
و ہدایت۔ بنا بریں خالدی صاحب کے اس ادعا سے بھی اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ
..... اس قصیدے کی حیثیت ایک ایسے متن کی ہے، جس کی تشریح
و تفسیر کے لیے اور کئی نظمیں لکھی گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معظم کے پورے

نظام فکر کو سمجھنے کے لیے یہ قصیدہ اجمالی تعارف کا کام دیتا ہے۔ اس
کو ان کے کلیات کا ایک ایسا منظوم مقدمہ تصور کیجیے، جس میں انھوں نے
مختصر طور پر وہ سب کچھ کہ دیا ہے، جس کو انھوں نے دوسرے اصناف
سخن میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

شاہ معظم نے زیرِ نظر قصیدے اور دوسرے کلام میں جس تصوف اور سلوک کو
پیش کیا ہے اور اُن کے بیان کے لیے جو اصطلاحیں استعمال کی ہیں، وہ جانم اور حضرت
امین کی دینِ مجدد اُن کے تفصیلی مطالعے کے لیے راقم الحروف کی کتاب، سید شاہ
امین الدین علی اعلیٰ - حیات اور کارنامے، سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ یہاں تفصیل
میں گئے بغیر صرف انھیں مسائل کی وضاحت کی جائے گی جو قصیدے میں آئے ہیں۔
قصیدے کا آغاز حسب ذیل اشعار سے ہوتا ہے:

مجاں فرض ہے بوجھنا امر اللہ اکبر کا : جو افلا تضر و بولیا سو کیا ہے رمز دل بر کا
لوازم سب پو آیا ہے پچھتا پچھا پچھتا : جو یاں اندھا سو حال اندھا خبر ہے روزِ شکر کا
اللہ کا فرمان ہے : قل لا رُوح مِن اَمْرِ بَنی ، یعنی تو کہ (اے محمد) روح میرے
پروردگار کا حکم ہے، اور دَیْنِ اَنْفُسِکُمْ اَخْلَا تَبْصِرُوْنَ ، یعنی اور تمہارے نفسوں میں
ہے، کیا تم نہیں دیکھتے۔

روح امر رب ہے، یہی منظر حق ہے اور سر ذات ہے۔

گر نمودے ذات حق اندر وجود : آب و گل را کے ملک کرے سجود
شیخ اکبر کہتے ہیں : جسم و صورت آدم حکمت ظہور احکام اسما و صفات الہیہ ہے اور
روح آدم یعنی باطنی حالت حکمت ربوبیت و خلافت ہے۔ پس آدم ربو بیت و
اتصاف صفات الہیہ کے اعتبار سے عالم کے لیے حق ہے اور ربو بیت و عبودیت

کے اعتبار سے خلق ہے، یعنی باعتبار روح حق ہے اور باعتبار جسم و صورت خلق۔
شاہ معظم نے تصدیق کے پہلے مصرعے میں تصوف کے اسی معرکہ آرائی کے
کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ امر رب کی حقیقت اور اس کا عرفان سالک
کے لیے ضروری ہے اور اسی سلسلے میں دینی انفسکھ اخلا تبصرون کی طرف رجوع
کیا ہے یعنی جو کچھ سالک جاننا چاہتا ہے وہ کہیں اور نہیں خود اس کے اندر موجود ہے،
اس کے نفس میں پوشیدہ ہے۔ ضرورت صرف اس کے کہ نہ تک پہنچنے کی ہے۔
اسی لیے رسول کریم نے فرمایا ہے: وَمَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ۔ یعنی
جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے خدا کو پہچانا۔

تعبیر اعتباری اور غیریت مجازی کے تسلیم کو تو ذکر عرفان نفس اور عرفان ذات بلکہ
قرب ذات حاصل کیا جاسکتا ہے، اور یہ سنی ہر ایک پر لازم ہے۔ اگر انسان عالم رنگ
بوکا اسیر اور غفلت کا شکار رہا اور اس نے عرفان نفس اور عرفان ذات میں سعی نہیں
کی تو اس کی حالت اندھے کی سی ہے۔ ایسے اندھے کی جس کے بارے میں خود اللہ
تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ اَعْمٰی فِهٰوْی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی واصل
سبباً، جو اس جہاں میں اندھا ہے وہ اُس جہاں میں اندھا، اور زیادہ دور جا پڑا راہ
سے، یہی جس کو یہاں دیدار ذات نصیب نہ ہو وہ ہمیشہ کے لیے دیدار الہی سے محروم
رہے گا۔

اس کے بعد شاہ معظم کہتے ہیں کہ انسان دنیا میں بار بار نہیں آتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ
نے جو ذمہ داریاں اس پر عاید کی ہیں ان سے جلد از جلد عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنی
چاہیے۔ اگر عشق کی دولت کو جو امانت الہی ہے، ضائع کیا، خلافت کے منصب
سے روگردانی کی، اسرار و وحد جو خود اس کے اندر پوشیدہ ہیں، کی یافت سے
احتراز کیا تو اُس نے گویا دین اور دنیا دونوں کو برباد کیا۔ سالک کو چاہیے کہ ماسوا سے

رشتہ توڑ کر وصل الہی اور دیدار ذات کا آرزو مند رہے، تلاوت و جود، میں وقت
گزارے، پیر کے آگے گردن جھکا دے اور اس کی رہنمائی میں سلوک کے منازل
و مراحل طے کرے،

غرض ہے پھر کے آئین، اسی تے عرض کرتا ہوں

نباؤ ابیگ کر لیا عزیزاں پیش پستر کا

جو طالب، طلب و حرا ہے، خدا سوں وصل ہونا کر

پچی پڑھ من عرف کی جود رس لے راہ، رہبر کا

اس کے بعد سلوک ایمینیہ کے بعض لوازم و شرائط کی طرف اُچھٹے سے اشارے کیے
ہیں، لیکن ان میں ربط و تسلسل نہیں ہے۔ پانچویں، ساتویں، چودھویں، پندرھویں، سولہویں
اور اٹھارویں شعریں یہ مضامین آئے ہیں۔

سالک کو چاہیے کہ پیر کامل کی رہنمائی میں مقام شیطانی سے نکلے اور مقام قرب
کا سفر اختیار کرے۔ ان دو مقاموں کے درمیان چار راہیں اور چار منزلیں ہیں، اول
راہ شریعت و منزل ناسوت (مرتبہ واجب الوجود) دوم راہ طریقت و منزل ملکوت،
(مرتبہ ممکن الوجود) سوم راہ حقیقت و منزل جبروت (مرتبہ ممکن الوجود) چہارم راہ
و منزل لہوت (مرتبہ عارف الوجود)۔ سالک ہر مرتبے کی راہ اور منزل سے گزرتا لوازم
و شرائط کی تکمیل کرتا۔ شہادت اختیار کرتا، دوسرے مرتبے میں عروج کرتا ہے۔ پہلے

مرتبے کی شہادت مہدا، دوسرے مرتبے کی شہادت وجد، تیسرے مرتبے کی شہادت
عدا اور چوتھے مرتبے کی شہادت شہدا ہے، لیکن تعجب ہے کہ معظم نے پانچویں تن کی
شہادت کو شہدا بتایا ہے۔ یہ یقیناً کتابت کی غلطی ہے۔ پانچواں مرتبہ یا پانچواں تن
و احد الوجود ہے۔ اس مرتبے کو دوسرے بزرگ احادیث، مرتبہ لاهور و اراوراء وغیرہ
کہتے ہیں معظم نے یہاں درالاور اور کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ مرتبہ حق سبحانہ تعالیٰ کا

ہے جو واحد ہے۔ یہ وجود خود قائم ہے، قدیم القیم ہے، ازل ازال ہے، لا جہت و لامکان ہے، لائقین والازمان ہے۔ ایسی وجود سے عارف الوجود، متبع الوجود، ممکن الوجود اور واجب الوجود ظاہر ہوئے ہیں۔ اس لیے سالک کو مرتبہ واجب الوجود سے ممکن الوجود میں، ممکن الوجود سے متبع الوجود میں، متبع الوجود سے عارف الوجود میں اور عارف الوجود سے واحد الوجود میں عروج کرنا چاہیے تاکہ مقام قرب نصیب ہو، جو صوفیہ اس مرتبہ کو درالوار کا نام دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جب سالک کی نظر نماں و مکاں ہر دو عالم سے مرتفع ہو جاتی ہے اور وہ ذاتِ حق کو لامکان دیکھتا ہے تو مرتبہ وراہ الوار میں داخل ہوتا ہے۔

عارف الوجود (جو تھے تن، میں شہادت شہدا پر سلوک کے تمام مراحل مکمل ہو جاتے ہیں اور سالک کے لیے سعی و جہد کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ وہ کامل تو ہوجاتا ہے لیکن مجہوبیت و معشوقیت کا مرتبہ اس سے بالاتر ہے۔ اس کا حصول صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی پر منحصر ہے۔ یہ مقام معراج پر طفیل اُن حضرت میسر آتا ہے۔

واحد الوجود میں سالک پر دو تجلیوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ایک تجلی جلالی اور دوسری جمالی۔ تجلی جلالی مرتبہ عاشقیت ہے اور تجلی جمالی درجہ معشوقیت و مجہوبیت۔ دوسری تجلی، پہلی تجلی سے افضل ہے۔ اس سے آگے کوئی مرتبہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے مرتبہ عاشقیت پر فائز کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے مرتبہ معشوقیت پر معظّم نے صرف مرتبہ عاشقیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس کے بعد پانچ موزیوں، چھ غفلتوں اور سات مستیوں کا ذکر ہے۔ حالانکہ ان کا ذکر ابتدا میں ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ حضرت امین پانچ عناصر پچیس گن، ان کے لوازمات وغیرہ کی تفصیل اور موزیوں، غفلتوں، مستیوں وغیرہ کا بیان واجب الوجود کے تحت کرتے ہیں۔

پانچ موزیوں سے مراد حواسِ خمسہ ظاہری، چھ غفلتوں سے مراد طبع، تکبر، غصہ

دہشت، بیماری اور پیری اور سات مستیوں سے مراد ذات، نسب و نسل، وسیلے، حسن، ہنرمندی، علم ظاہر، مال و دولت، حکومت و اقتدار کا غور ہیں۔ یہ فانی ہیں لیکن ایک مستی کو بقا ہے اور وہ حب ذات الہی ہے۔

معظّم کہتے ہیں کہ سالک کو چاہیے کہ وہ حواسِ خمسہ ظاہری پر قابو پائے، حواسِ خمسہ باطنی کو کام میں لائے، مکاں کے قیود سے آزاد ہو کر لامکان کی راہ اختیار کرے۔ جو چیز جس میں قرار پاتی ہے وہ اس کا مکان ہے مثلاً: صفا مکانِ باد اور باد مکانِ آتش اور آتش مکانِ خاک اور خاک مکانِ آب ہے۔ سالک کو چاہیے کہ صفا کو ہوا میں، ہوا کو صفا میں، مکان کو لامکان میں، لامکان کو مکان میں دیکھے، اس لیے کہ جمع مراتب ایک دوسرے کا منظر و مسکن ہیں۔

طبع، تکبر، غصہ، دہشت، بیماری اور پیری غفلتوں میں اور غفلتوں کا سرچشمہ بھی سالک کو چاہیے کہ ان غفلتوں کو اپنے پرطاری ہونے اور غلبہ پانے کا موقع نہ دے، بلکہ ہمیشہ اُن سے چوکس رہے۔ تبھی وہ منج گنج یعنی پانچوں وجودوں پر پانچویں وجود کی دولت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔

نسب و نسل، وسیلے، حسن، ہنرمندی، علم ظاہر، مال و دولت اور حکومت و اقتدار کے غور کو کچلے اور ان کی نفی کرے اور حب ذات الہی کے نشہ میں مرشار رہے، اسی صورت میں اس کو مقامِ قرب حاصل ہو سکتا ہے۔

یہاں اتنی بات کی مہارت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ سلوکِ اعینیہ میں موزیوں، غفلتوں اور مستیوں کا تعلق پہلے تن یعنی واجب الوجود سے ہے۔ ان پر قابو پانے اور دوسرے شرائط و لوازم کی تکمیل کے بعد سالک اوپر کے مرتبے میں داخل ہوتا ہے۔ منج گنج بلازال کا گھر اور قرب کا محل تو آخری یعنی پانچویں مرتبے میں حاصل ہوتا ہے۔ ستہ معظّم نے ایک مہجست میں درمیانی مراتب طے کرادیے ہیں:

مقامات بعد منزل کو جو لیاوے چار، رہبر سوں
رفیق ایسا اچھے رہ برج واقف خیر ہو رشر کا

اول زاهد سوں عارف پسو بعد از عاشق واصل

دراول در اسے درجہ (جو) چل کر باٹ سرور کا
شہادت پانچ تن سوں ہو جو باپنے تو کتے شہدا

لقب عشاق اس کا ہے وہ محرم راز دل بر کا
قتل کر پانچ موزیاں کوں ایذا تج نہیں دیے تب لگ

نکل شش جہت سوں باہر لے مارگ لامکاں گھر کا
ز پر شش غفلتاں میں توں اگر ہے عاشق صادق

کہہ ہیں تیج گنج پاوے توں تو مالک ہفت کشور کا
نفی کر سات مستیاں کوں جو ہوے اثبات جب مولا

قرب کا محل پاوے تو وہ صاحب تخت انور کا
شاہ معظم نے چھٹے شعر میں جس سلوک کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کا تعلق وجود

خمسے نہیں ہے،

نفس، دل، روح سوں تجھ کوں کرے مر، نور سوں ماننا

سو بعد از نور میں دیکھے تو دستا ذات انور کا

اس سلوک کا سرچشمہ فیضان حدیث قدسی: اِنَّا فِيْ جَسَدٍ اَدَمٍ لِّمُصَفًّوَةٍ وَفِي
الْمُصَفًّوَةِ قَلْبٌ وَفِي الْقَلْبِ فُؤَادٌ وَفِي الْفُؤَادِ رُوحٌ وَفِي الرُّوحِ سِرٌّ وَفِي السِّرِّ
نُورٌ وَفِي النُّوْرِ اَنَا ہے، اور سالک کو معرفت من عرف کے لیے مراتب نفس، دل
روح، سر اور نور سے گزرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ذات کا مرتبہ ہے
قصیدے کے دوسرے اشعار میں شاہ معظم کہتے ہیں کہ ایسے علم سے کیا حاصل

جس سے عرفان ذات اور حال حق نصیب نہ ہو۔ دفتر کے دفتر کھنگال ڈالے کچھ حاصل
دھوکا۔ ایک نقطے کا عرفان کافی ہے۔ یہ نقطہ کیا ہے! ذات بخت، جس میں کل کائنات
مخفی ہے جانم کہتے ہیں: العلم نقطہ۔ اُن کلام است! ذات باری تعالیٰ کے عالم الغیب
و الشہادت اُن نکتہ قدیم است کہ از نکتہ او ہمہ نکات باز آئند۔

محکم دراصل یہ کہ رہے ہیں کہ علم ظاہر یعنی کتابی علم حقیقی علم نہیں ہے بلکہ علم باطن
نور علم لدنی ہی حقیقی علم ہے۔ یہ حاصل ہو جائے تو انسان پر سب کچھ منکشف ہو جاتا ہے اور
یہ حاصل نہ ہو تو علم ظاہر میں کمال کے باوجود انسان اصل حقیقت اور سر علم سے بے بہرہ
رہتا ہے۔

ہوا میں حق مستے واصل علم تحصیل کیا تو کیا

بجھانت ایک نکتہ ہے بحث کیا کام دفتر کا

زاهد ساری عمر عبادت و ریاضت میں گزار دیتا ہے لیکن اس کو کچھ حاصل نہیں ہوتا اور
اگر چہ تا بھی ہے تو عارف کی یافت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس لیے
کہ ایک گھڑی کا تفکر ستر برس کی عبادت سے افضل ہے۔ قرآن میں آیا ہے۔ اِنَّ
لِلْعَاقِلَةِ تَنْهٰی عَنِ الْفِعْثٰی وَالْمُسْكِرِ وَلَسٰی كُرْ اَللّٰهُ اَكْبَرُ۔ (مازے حیاتی و
پرورداری کو روکتی ہے اور البتہ ذکر الہی سب سے افضل ہے)

زہد کہ زاهدان مرتے عجب ہے مشرب زنداں

تفکر ساعت کا کرتے عبادت برس ستر کا

سالک تمام مراحل و منازل طے کرنے کے بعد و احوال وجود میں آتا ہے، تو ذات حق
بہنہ مئے اتم حاصل کر کے باقی بر بقاے ذات حق ہو جاتا ہے۔ مرجعہ جمو بیت فضیل
اُن صورت حاصل ہوتا ہے اس لیے کہ عارف کی انتہائی مد سید اللہ فی الہول لرحول

مع الرسول ہے۔ سید اللہ فی اللہ مع اللہ رسول اکرم کے ساتھ خاص ہے۔ عرفا جس قدر تجلیات الہی کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ رسول اکرم کے اندر ہی کرتے ہیں۔ اگر یہ واسطہ درمیان سے ہٹ جائے تو سرے سے کائنات ہی ختم ہو جائے۔ سوائے رسول اکرم کسی میں راست معرفت الہی حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

فنا فی اللہ ہو اول توں و مشاہد ہو رستا باقی

نقابِ کبریا مینا نے وصل ماہِ منور کا

سالمک کی منزل حور و قصور نہیں دیدار ذات ہے۔ سالمک اور زاہد میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک دیدار کا آرزو مند ہے اور دوسرا جنت کا طالب، ایک کے حوصلے کی کوئی حد و انتہا نہیں اور دوسرا پست ہمت۔ ایک اپنے عزائم کی وجہ سے مردوں کا مرد ہے اور دوسرا اپنے مقصد کی بلے مانگی کے اعتبار سے عورتوں سے بھی گیا گرا۔ کسی بزرگ کا قول ہے، طَالِبُ الدُّنْيَا مَخْتَلٌ وَطَالِبُ الْعُقْبَى مُؤَنَّثٌ وَطَالِبُ الْمَوْفَى مُذَكَّرٌ یعنی دنیا کا طالب مختل، عقبی کا طالب مؤنث، مرد می ہے جو دنیا اور عقبی دونوں سے بے نیاز ہے اور اس کی نظر اپنے سوا لاپر لگی ہوئی ہے۔ معظم نے طالب دنیا کو درخدا اعتنا نہیں سمجھا، اس لیے اس کو نظر انداز کر دیا ہے

بجز دیدار اسے سالمک نہ منگ فرو دس ہرگز توں

بہت سب میں تفاوت ہے مونث چور مذکر کا

اللہ تعالیٰ دو عالم کا مالک ہے اور مجبور میں جتنی مخلوق ہے اس کا پروردگار شکر کرنے والا ہے۔ اس کی رحمتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اس لیے سالمک کو کسی منزل اور کسی مرتبے پر مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وہ کہے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔

امید لا تقطو کی رکھ نہ کہ کچھ فکر سرگز توں

وہ مالک ہے دو عالم کا وہ رازق بحر و بر کا

کسی بزرگ کا قول ہے: علم کی انتہا یہ ہے کہ انسان اللہ کو پالے۔ یہ علم کیا ہے؟ تلاوت وجود، عرفان نفس و عرفان بطون، یعنی انسان خود اپنی ذات میں فکر کرے۔ اس لیے کہ وجود انسانی منظر ذات و صفات ہے۔ خاوندہ امینی کی تعلیم ہے کہ سالمک کو چاہیے کہ وہ اپنے وجود میں پانچوں وجودوں کی یافت کرے۔ عرفان ذات اسی طرح ممکن ہے۔

حدود العلم حتی یعرف اللہ کو خبر دیتا

نکدہ کہ تو بطوں میں توجہ ہوے شیخ کشف برتر کا

اس قصیدے کا ایک شعر بہت عجیب ہے:

کنک عوام کہتے ہیں جو ظاہر دیکھنا حق کوں

جو کچھ دستا سو فانی ہے کنا کیوں روپ یاور کا

معظم کہتے ہیں کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا کو ظاہر و آشکار دیکھنا چاہیے، لیکن جو کچھ دکھائی دیتا ہے، فانی ہے۔ فانی کو خدا کا منظر کس طرح سمجھا جاسکتا ہے؟

چنانچہ اس بات میں معظم کا محض شاعرانہ تکیہاں ہے یا انھوں نے جو کچھ کہا ہے ایک مسئلے کے طور پر کہا ہے۔ اس لیے کہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی جہت تشبیہ ہے شیخ کہتے ہیں کہ خدا مقید میں مقید ہے اور مطلق میں مطلق۔ تقید اور تعین جو وجود کو عارض ہوتا ہے، فانی ہے، وجود فانی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ هو الباطن ہی نہیں هو الظاہر بھی ہے۔

لے محمود خوش دہاں کہتے ہیں کہ سالمک اپنے وجود میں چار وجودوں کی یافت کرے۔ سالمک را باید کہ اس چار مراتب وجود واجب الوجود، ممکن الوجود، متعین الوجود و عارف الوجود در وجود خود بشناسد و برسد و بگذرد تا بحرفت ذات سبحانہ و تعالیٰ برسد، معرفت السلوک۔

ماہِ المعجودیت سے وجود منتزع ہوتا ہے اور وجود کل یوم ہونی الشان ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے سوا جہاں ہر شے فانی ہے وہیں ہر شے مجلایں الہی بھی ہے۔
 ہر حال اپنے سلسلے کی تعلیمات کے بعض پہلوؤں کو اس مختصر قصیدے میں شاہِ معظ نے اس قدر گتھا کر بیان کیا ہے کہ وہ ان کے سلسلہ تعلیمات کا ایک ناقص اشاریہ (بقول خالدی صاحب مقدمہ نہیں) بن کر رہ گیا ہے۔ وہ حسب عادت اس قصیدے کو بھی اپنے پیر قادر لنگا کے ذکر پر ختم کرتے ہیں، جس کے ساتھ پیر کے پیر حضرت امین کا نام بھی آگیا ہے۔

ہر اتروک پر غوغا کہ ثانی آیا یوسف

نویلا لال قادر شاہ صورت لے سب پیر کا
 وہی ہر راہ دکھلانے امین الدین ہو آیا
 وہ شافع روزِ محشر ہے وہ ساتی حوضِ کوثر کا
 معظم تو بندہ ہو رہ، خدا ہونا تو مشکل ہے
 سمجھ محیط مطلق کوں دے لے دانو داور کا

QASID KITAB GHAR

Mohammad Hanif Razvi Nagarchi
 Near Jamia Masjid, Arcot Dargah,
 BIJAPUR-586104, (Karnataka)

گفتار عقل و عشق

اس مختصر مثنوی کا ایک ناقص نسخہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو کی اس قدیم بیاض (مخطوطہ نمبر ۲۷۰) میں ہے، جس میں مرزا، شاہی، خوشنود، صادق، مشرف، شاد، جواد، جامی جیسے معروف اور مراد فصیح الدین، محبت اور قربان علی جیسے غیر معروف شعرا کے مراثی کے علاوہ سراج نے چند شعر اور گوہری کی ایک رباعی شامل ہے یہ بیاض ۱۱۱۶ھ ہجری سے قبل لکھی گئی ہے۔ چنانچہ صدق (۱۴) کی پیشانی پر ایک بیضی مہر ثبت ہے، جس میں اللہ حمد علی ۱۱۱۶ھ ہجری درج ہے۔
 اس نسخے میں کل آٹھ شعر ہیں۔ مثنوی کا نام کہیں درج نہیں ہے۔ ڈاکٹر زور نے غالباً موضوع اور مضامین کے اعتبار سے اس کا عنوان "مثنوی مناظرہ عقل و عشق" تجویز کیا ہے۔

ابونصر خالدی صاحب کو اس مثنوی کا ایک اور نسخہ ان کے ایک دیرینہ کرم فرما

نے ڈاکٹر زور نے شاعر کا نام روٹی بتایا ہے، لیکن یہ درست نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو۔ تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو، جلد اول، صفحہ ۲۶۵، ڈاکٹر زور نے نمونے کا جو آخری شعر نقل کیا ہے اس میں جامی کا تخلص موجود ہے۔ آخری شعر کے پہلے مصرعے میں روٹی کے لفظ سے انھیں تسامع ہوا ہے۔ یہ تخلص نہیں ایک اصطلاح ہے۔

کی ملوکہ بیاض سے دست یاب ہوا ہے، جس میں دس شعر ہیں
ادارے کے نسخے کا ہر پہلا مصرع "عقل" سے اور دوسرا مصرع "عشق" سے شروع
ہوتا ہے۔ مثلاً اس نسخے کا پہلا شعر ہے :

عقل کہتی علم پڑنا لکھنا سیکھ ۛ عشق کہتا درس کا تو مانگ بھیک
لیکن خالدی صاحب کے نسخے کے ہر پہلے مصرعے میں "عقل" سے پہلے "مجھ" اور
ثانی مصرعے میں "عشق" سے پہلے "اور" کا اضافہ ہے :

مجھ عقل کہتی علم پڑھ لکھنے کو سیکھ ۛ اور عشق کہتا درس کا تو مانگ بھیک
خالدی صاحب نے اپنے "دیرینہ کرم فرما" کے نسخے کا ادارے کے نسخے سے مقابلہ
کر کے اس مثنوی کو "گفتار عشق و عقل" کے نام سے رسالہ قدیم اردو، جلد اول، ۱۹۱۵ء
میں شائع کیا تھا۔ انھوں نے اپنے "دیرینہ کرم فرما" کے نسخے کے بارے میں کچھ نہیں
لکھا ہے۔ اس لیے معلوم نہ ہو سکا کہ اس نسخے پر مثنوی کا نام "گفتار عشق و عقل" لکھا ہے
یا انھوں نے ڈاکٹر زور کے دیے ہوئے نام میں تصرف کر کے مناظرہ عقل و عشق کو "گفتار
عشق و عقل" بنا دیا ہے۔

مناظرہ عقل و عشق کے مقابلے میں "گفتار عشق و عقل" زیادہ بہتر عنوان ہے۔ اس لیے
کہ مثنوی کے مضامین کی نوعیت مناظرے کی نہیں گفتار کی ہے۔ شاہ معظم نے سوائے
پہلے شعر کے مثنوی کے ہر شعر کے پہلے مصرعے میں عقل کی اور دوسرے مصرعے میں عشق
کی گفتار کو نظم کیا ہے۔ اس لیے عنوان بھی اسی ترتیب کا متقاضی ہے۔ بنا برائیں اس
مثنوی کا عنوان "گفتار عقل و عشق" تجویز کیا جاتا ہے۔

ہمارے حکما اور صوفیہ، قدیم سے حصول علم کے دو ذرائع عقل و عشق کو دو متفاد
قوتوں کی حیثیت سے تسلیم کرتے آئے ہیں، اور عقل پر عشق کو ترجیح دیتے دیکھ رہے ہیں۔
تمام صوفیہ نے عموماً اور صوفی شہداء نے خصوصاً عقل کے نام پر عشق کو اتنا اہمیت

دی ہے کہ عقل کی طاقت بیچ اور ناکارہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ عقل کو اتنا
گرایا کہ نفس کے تمام مذموم داعیات کا وہ سرچشمہ اور آئینہ کار سمجھی جانے لگی۔ اسی طرح
معز کو "خیر و شر میں عشق کو خیر کا اور عقل کو شر کا علم بردار بنا کر دونوں کو ایک دوسرے کا
حریف اور مقابل بنا دیا گیا۔ اگر ہم برگساں کی طرح وجدان کو عقل کی اعلیٰ کار فرمائی سے
تعبیر نہ بھی کریں تب بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عقل و شعور کی توانائی ہی پر ہماری مادی
زندگی کا وارو مدار ہے۔ عقل کی قوت اسباب و علل کے سہارے علم حاصل کرتی ہے
اس لیے اس کی کار فرمائی زندگی کے مادی مظاہر تک محدود ہے۔ وہ حقیقت کا ادراک
تو نہیں کر سکتی لیکن انفس و آفاق پر غور کر کے حقیقت کے قریب تک پہنچ جاتی ہے۔
اس کے برخلاف عشق یا وجدان وہ توانائی ہے جو حقیقت کا راست ادراک کرنے
کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کو اسباب و علل کے سہاروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ادراک حقیقت کے تعلق سے عقل و عشق کی توانائیوں کے اس فرق کی بنا پر
یہ نتیجہ اخذ کرنا بدابہت اور معقولیت کے خلاف ہے کہ عقل کی قوت بیچ اور ناکارہ
ہے یا یہ کہ عقل داعی شر ہے۔ عقل اور عشق کی توانائیوں اور ان کی کار فرمائیوں کے حدود
کے بارے میں پہلی مرتبہ اقبال نے معقول اور متوازن نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے ہمارے
صوفیہ اور شعرا کی غیر مقتدل رائے کی اصلاح کی ہے

دکھنی شاعری میں عقل اور عشق کی کرشمہ سازیوں کا ذکر تو ملتا ہے لیکن نصر قی لہ
اور علی عادل شاہ ثانی شاہی نے ان موضوعات پر جو زور بیان صرف کیا ہے، ان کی مثال
نہیں ملتی۔

ۛ ملاحظہ ہو، گلشن عشق مرتبہ سید محمد، صفحہ ۴۲ تا ۵۱
ۛ ملاحظہ ہو، قصیدہ در حمد اور قصیدہ در منقبت دو ازادہ امام علیہ السلام
کلیات شاعری، صفحہ ۱۱، مرتبہ ڈاکٹر زینت ساجدہ۔

نصرتی عقل کو نصف الکرامت بلکہ فوق الکرامت تسلیم کرتا ہے اور اس کو دین و دنیا کی کامیابی کی علیحدہ کرتا ہے۔

بزرگاں کا یہ نقل حجت اس ہے : کہ العقل نصف الکرامت ہے
 کہ بلکہ فوق الکرامت سدا : کہ اس عقل سوں ہم بچھانے خدا
 اچھے عقل ایک دولت نا پدید : اچھے عقل مشکل کی حل کی کلید
 اچھے عقل پیرائے بندگی ! : اچھے عقل سرمایہ زندگی
 دیوے عقل نت ملک شہ کل نوا : ولی کی ولایت کون ہے پیشوا
 چلے عقل تے دین و دنیا کے کام : دونوں جگہیں عاقل سے نیک نام
 لیکن اس کے باوجود وہ عشق کو عقل پر فضیلت بخشتا ہے :

کے عقل کون میں تو شاو زماں : نہ ہوتا اگر عشق صاحب قرآن
 کہ جس ٹھار پر ہوئے شرنے کی چال : تو اس ٹھار گج کا چلے کیا مجال
 اہل عقل کا گرچہ گنج مست ہے : ولے عشق شرنہ زبردست ہے
 اور کہتا ہے :

بقا کی جسے جگ میں شاہی اچھے : اہل جس کے گھر کا سپاہی اچھے
 دیوار راہ کا تجھ سو کا لادے : اندھا راج تیرا او جالا دے
 تر اغار بہتہ ہے گلزار تے : تیرا در ہے دیوانہ ہشیار تے
 چڑا وے سستی کون ترالے دن : دکھا وے تے آگ کر چھو لہن
 نصیحت کو تجھ شہر میں قدر ہے : ترے ملک میں صبر بے قدر ہے
 شاہی نے عقل اور عشق کا موازنہ نہیں کیا ہے بلکہ دو علاحدہ قصیدوں میں ان کی
 الگ الگ بڑائی کی ہے۔ چنانچہ عقل کی تعریف میں کہتا ہے :
 عقل کا مکتب ہوا ہم کے پڑھنے بدل : عقل معلم ہیں قصہ سکھایا کہن

عقل خبردار ہے عقل ہمہ کار ہے : عقل کا جاسوس ہو مک پہ اچھے کو کر
 ہال تے با یک تراد اچھے جو کو مل : ہاؤ کے دھجے ہیں پگ عقل کیا واں گون
 عقل کا جس کھٹ نے پورا اچھے گا کھٹا : حق کون وہی پا اول راہ نگاہے لکن
 اور عشق کی مدح کرتے ہوئے ایک شاعر نے عقل اور عشق کا مقابلہ اس طرح کیا ہے :

نادر ہوا سلطان یو اب بد کیا حیران ہو

جب عشق کے پردہ حائل ہد سات صف در صف لڑے

ان اشعار میں بھی ندرت فکر اور ندرت بیان کے باوجود عقل و عشق کے وہی پرانے
 تصورات کی کار فرمائی نظر آتی ہے، جن کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، لیکن تعجب ہے
 کہ معظم نے زیر نظر مثنوی میں اپنے عہد کے مروجہ تصورات کے برخلاف نہایت متوازن اور
 معقول نقطہ نظر اختیار کیا ہے۔ وہ نہ تو عقل کو ناکارہ قرار دیتے ہیں اور نہ شرکارہ، بلکہ
 اس قوت کو اس کے مادی مزاج کے پیش نظر یا بندی اعمال شریعت کا داعی قرار دیتے
 ہیں۔ وہ عقل کی اس تحریک و ترغیب کا بھی ذکر کرتے ہیں جو مادی زندگی کو سنوارنے کا باعث
 ہوتی ہے تو اس کو شری پسند، حیلہ جو اور محصیت کار نہیں بتاتے بلکہ اس کی عظمت اور
 رخصت ہی کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں کہیں کہیں تو فکر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی
 ہے کہ اس مقام پر عقل کی رہبری درست ہے یا عشق کی۔

اور شاعری میں عقل و عشق کے مباحثوں، مناظروں اور مقابلوں کی کمی نہیں، لیکن
 اس پورے سرمائے میں اقبال سے پہلے شاید معظم کے علاوہ کسی اور شاعر نے ایسا
 سجادہ ہوا نقطہ نظر اختیار نہیں کیا ہے۔ تشریف البتہ جو نے عقل کی تعریف میں بڑا نظم دکھایا ہے۔
 معظم عقل اور عشق کی متضاد تحریکات و ترغیبات کا جائزہ لیے سے پہلے کہتے ہیں
 کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دو یار دیے ہیں، ایک عقل اور دوسرا عشق،

مجھ حق دیا ہے پیار کر دیکھ یار دو : اک عشق دوسرا عقل ہے دل دار یو

پہلے شعری سے عظم کے نقطہ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ عام شوائی طرح عقل کو ناقص، فتنہ کار اور راہ زن نہیں سمجھتے بلکہ عشق کی طرح عقل کو بھی زندگی کے لئے ایک مدد و معاون توانائی قرار دیتے ہیں، اور ان دونوں طاقتوں کو اپنائیت اور یاد رکھتے ہیں۔ یہی اُن کے نقطہ نظر کی صحت مندی کی دلیل ہے۔

نظم کا اسلوب یہ ہے کہ عقل ایک مشورہ دیتی ہے اور عشق دوسرا مشورہ دیتا ہے۔ ان دونوں کے مشوروں میں تضاد ہے اس کے باوجود سوائے ایک آدمہ شعر کے ہر جگہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ عقل کا مشورہ زندگی کے مادی حقیقتات کے مطابق ہے۔ اس لئے اپنے اندر وزن اور وقار رکھتا ہے۔ عشق کا مشورہ عقل کے مشورے سے مختلف بلکہ متضاد ہے۔ اس لیے کہ وہ اسباب و علل کی منزلوں کو درجہ بہ درجہ طے کرنے کا قائل نہیں بلکہ ایک جست میں حقیقت تک پہنچ جانا چاہتا ہے۔

عقل عظم کو مشورہ دیتی ہے کہ اے عظم علم حاصل کر اور کھنڈا پڑھنا سیکھ لیکن عشق کہتا ہے، یہ سب فضول ہے۔ ان سب کو چھوڑ کر دیدارِ یاری بھیک مانگ۔
مجھ عقل کہتی علم پڑھ لکھنے کو سیکھ ۛ اور عشق کہتا درس کا جا مانگ بھیک
اس شعر کو پڑھ کر قیاس ہوتا ہے کہ عظم نے جب یہ شعر کہا تھا تو ان کے ذہن میں خسرو کا حسب ذیل شعر ضرور ہو گا،

خسرو غزل و کتاب تا چند ۛ در مصحف روے او نظر کن
عقل کہتی ہے، اے عظم علما کی صحبت اختیار کر اور عشق کہتا ہے کہ علم سے بے زار

ہو جا :

مجھ عقل کہتی عالمان سے یاد ہو ۛ اور عشق کہتا علم سے بے زار ہو
عقل کہتی ہے : اے عظم صوم و صلوات اختیار کر اور عشق کہتا ہے کہ معرفتِ الہی حاصل کر اور تکلیفِ شرعی سے نجات پالے :

مجھ عقل کہتی صوم اور کرنا صلوات ۛ اور عشق کہتا حق سے مل پانا نجات
اس طرح ہر شعر میں ان دونوں طاقتوں کا ذکر کرتے چلے گئے ہیں :

مجھ عقل کہتی کام کرنا ہے ثواب ۛ اور عشق کہتا رات دن پینا شراب

مجھ عقل کہتی شہ سے مل انعام لے ۛ اور عشق کہتا ہے سہولت چھوڑے

مجھ عقل کہتی سیکھ کچھ کیا کری ۛ اور عشق کہتا چھوڑ کر بازی کری

مجھ عقل کہتی زر خرچ کر لے فخر ۛ اور عشق کہتا چڑھے تازی کر غزا

اور آخری شعر میں عقل کا مشورہ ہے : اے عظم، اٹھ اور کچھ کام کر۔ ظاہر ہے کہ یہ مادی زندگی علیٰ اور تدبیر کی زندگی ہے۔ اس کے برخلاف عشق کا مشورہ ہے کہ اے عظم دنیا کی کشائش سے یک نیت بے تعلق ہو جا اور قلور کی ذات میں فنا ہو کر قلبِ مطہر اور نشاط نام حاصل کر۔

مجھ عقل کہتی اٹھ عظم کام کر ۛ اور عشق کہتا قلور سے مل آرام کر
جیسا کہ تہذیب میں اشارہ کیا جا چکا ہے، عظم نے اس شہوی میں عقل کی کار فرمائی، اس کے حدود و مقننات اور مزاج کی پوری رعایت ملحوظ رکھی ہے اور زندگی میں شعور کی اہمیت اور افادیت کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اگرچہ پوری نظم میں کہیں بھی شاہِ عظم نے عقل اور عشق میں سے کسی کی حمایت نہیں کی ہے، لیکن مجموعی آہنگ سے صاف ظاہر ہے کہ عشق کا مشورہ شاعر کی افتاد و طبع کے عین مطابق ہے۔ اس کے باوجود اس نے معقولیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور عقائد کی اہمیت اور افادیت اور عظمت کو پوری طرح تسلیم کیا ہے، البتہ صرف ایک شعر میں عقل کی حیلہ گری کی طرف اشارہ ملتا ہے :

مجھ عقل کہتی زر خرچ کر لے فخر ۛ اور عشق کہتا چڑھے تازی کر غزا

لیکن اس شعر سے بھی عقل کی فوہیں اور تدبیر مفصلاً نہیں ملتا۔ اور اس پر وہ یہ تانا بانہ ہے کہ وہ توانائی جو مادی زندگی کو متواتر کرنا اور بیکار کرنا چاہتی ہے۔ اسے معقول کی تکمیل کے لیے

صلحت، اندیشی اور کام جوتی پر بھی اثر آتی ہے۔ یہ بھی درحقیقت قوتِ عقل کے مزاج کا ایک تقاضا ہے۔

یہ مختصر متنوعی سلاستِ زبان، زورِ بیان اور روانی کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہے۔

سوالِ صادق و جوابِ معظم

شاہِ معظم کی ایک غزل اُن کے دیوان کے علاوہ بیاضوں میں بھی دستِ باب ہوتی ہے، جس سے اُس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ غزل انھوں نے شاہِ صادق اور نگ آبادی کے جواب میں لکھی تھی۔ شاہِ صادق اپنے عہد کے مشہور صوفی اور صاحبِ ذوق شاعر تھے۔ شاہِ کمال شادنی الحال اور بعض دھڑے صوفی شعرا نے اُن کا ذکر کیا ہے اور تصوف کے مسائل بیان کرتے ہوئے ان کے شعر نقل کیے ہیں، مثلاً شاہِ کمال نے اپنی کتاب کمالاتِ کمالیہ میں یہ سہل چسپ شعر نقل کیا ہے:

کیا نفع لو ہو سے جو ترے لکھے انا الحق
چوری کا گر چھپا کر مکہ مونہ چپ نگل جا

و جدی اور شاہِ صادق کے درمیان گہرے مراسم تھے۔ چنانچہ جدی نے خزنِ عشق انھیں کی ایسا پر لکھی تھی:

شاہِ صادق صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ سخاوت مرزا کا بیان ہے کہ اُن کے دو دیوان مولوی عمر یا فنی صاحب کے کتب خانے میں موجود تھے اور غالباً کتب خانہ انجمن ترقی اردو میں بھی ایک تھا۔ شاہِ صادق کی ایک غزل جس کی حیثیت

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سخاوت مرزا صاحب کا مضمون اردو کی ایک قدیم بیانیہ رسالہ امداد، بابت اپریل ۱۹۵۲ء، صوفیہ ۳۲

QASID KITAB GHAR
 Mohammad Hanif Razvi Nagarchi
 Near Jamia Masjid, Arcot Dargah,
 BIJAPUR-586104, (Karnataka)

سوال بند کی سی ہے، بہت مشہور ہوئی۔ سخاوت مرزا کا بیان ہے کہ شاہ کمال اور شاہ فی الحال وغیرہ نے اس کی تفسیر کی تھی بلکہ سوال نامے کی تفسیریں کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ ممکن ہے کہ ان حضرات نے شاہ صادق کے سوالات کے جوابات نظم کیے ہوں اور ہر سوال کے ساتھ اس کے جواب کا شعر جوڑ دیا ہو، جس کو مرزا صاحب نے تفسیریں سمجھ لیا۔ چنانچہ شاہ معظم کے جواب کو بھی وہ تفسیریں ہی سمجھتے ہیں۔ صادق کی غزل کا مطلع یہ ہے :

سائل ہوں میں عزیز اے اس کا جواب بولو

میں عرف ہو رہ نقد کے کہتے ہیں باب بولو

یہ گیارہ شعر کی غزل ہے، جس کے ہر شعر میں ایک سوال اٹھا یا گیا ہے۔ شاہ معظم نے بھی اس غزل کا جواب لکھا ہے اور ہر سوال کا انتہائی مختصر اور جامع جواب دیا ہے۔ سخاوت مرزا لکھتے ہیں :

”شاہ معظم خلیفہ قادر سنگھ کو تال خلیفہ امین الدین اعلیٰ بیجا پوری نے تو شاہ صادق کی اس غزل پر تفسیریں کی ہے اور چونتیس بیت لکھے۔“

سخاوت مرزا صاحب نے اس غزل کے لیے مجموعہ تحفہ انوار، کتب خانہ اصفیہ، کا حوالہ دیا ہے۔ یہ حوالہ انھوں نے حسب عادت ادا ہو دیا ہے، جس کی وجہ سے مجموعہ تحفہ انوار تک رسائی نہ ہو سکی، البتہ راقم الحروف کو مواد کی چھان بین کے دوران اس غزل کے چار نسخے دست یاب ہوئے ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے :

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، سخاوت مرزا صاحب کا مضمون اردو کی ایک قدیم بیانیہ رسالہ اردو، بابت اپریل ۱۹۵۳ء، صفحہ ۳۲، ۳۳۔ سخاوت مرزا نے عرف صادق کی غزل نقل کی۔

۲۔ قادر سنگھ نہیں، قادر لنگا ہے۔

۳۔ رسالہ اردو، بابت اپریل ۱۹۵۳ء، عیسوی، صفحہ ۳۲

۱۔ کتب خانہ اصفیہ، حیدر آباد

مخطوطہ نمبر (۲۷۵۹) جدید، تعداد صفحات (۲)، تعداد اشعار (۱۱)
اس نسخے میں شاہ صادق کی غزل پہلے لکھی ہے اور لوح پر ”سوال غزل دکھنی“ درج ہے۔ شاہ صادق کی غزل کے خاتمے پر ”در جواب آن نویسہ کی مرفی کے تحت معظم کی غزل نقل کی ہے۔ شاہ صادق کی غزل بارہ اشعار پر اور شاہ معظم کی غزل گیارہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نسخے میں شاہ صادق کی غزل میں جو شعر زاید ہے وہ حسب ذیل ہے :

قادر ہواے شہرت لے کر اٹھا ہے یوں کر

کوئی حل کرو مسائل اس کا جواب بولو

خاتمے پر ”تمت تمام شد سوال و جواب وجودیہ“ لکھا ہے۔

یہ نسخہ کرم خوردہ ہے اور بہت غلط لکھا گیا ہے۔

۲۔ کتب خانہ راقم الحروف

تعداد صفحات (۲)، تعداد اشعار (۱۱)،

اس نسخے میں بھی سوال و جواب دونوں شامل ہیں۔ شاہ صادق کی غزل کی لوح پر ”صادق راست“ لکھا ہے اور معظم کی غزل سے پہلے ”جواب معظم (معظم، درج ہے۔ دونوں غزلوں میں گیارہ شعر ہیں۔

۳۔ کتب خانہ راقم الحروف

تعداد صفحات (۲)، تعداد اشعار (۱۲)

راقم الحروف کے ہاں ایک بیاض کے چند صفات محفوظ ہیں۔

پہلے صفحہ پر ایک تہری رسالے معراج نامے کی چار سطریں ہیں۔ دوسرے صفحے سے سوال و جواب شروع ہوتا ہے۔

شاہ مملوک کی غزل کسی عنوان کے بغیر نقل کی گئی ہے، لیکن معظم کی غزل سے پہلے جواب سائل کو یہ لکھا ہے۔

غزل کے خاتمے پر حسب ذیل عبارت ہے۔

”تمت تمام شد کار من نظام شد۔ ایسا سوال و جواب از دست عظمت بر طریق یادگار نوشتہ شد“

تمت اوستہ کیا تمام

حق تھے حق ہو لیا کلام

اس نسخے میں معظم کے اشعار کی تعداد (۱۲) ہے۔ زائد شعراء ہے :

جب انجمن زنکار ہوئے تجھے میسر

گرتوں جگر کوں بریاں نقل کیا ہے یو

۴۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

درویش معظم (۱۷۱۰ء تا ۱۷۷۰ء) میں بھی یہ غزل شامل ہے، لیکن درمیانی صفحات کے غائب ہو جانے کی وجہ سے صرف چند شعراء گئے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صادق کا سوال اور شاہ معظم کا جواب کسی زمانے میں بہت مقبول رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نسخے میں سوال و جواب دونوں موجود ہیں۔ ذیلی میں وضاحتی اشاروں کے ساتھ یہ سوال و جواب پیش کیے جاتے ہیں۔

سوال : سائل جوں میں عزیزاں اس کا جواب ہو

من عرف ہو رفقد کے کہتے ہیں باب ہو

جواب : سائل ہوئے عزیزاں اس کا جواب ہو

من عرف ہو رفقد لے سب چار باب ہے یو

یعنی چار مراتب وجود : واجب الوجود، ممکن الوجود، متنع الوجود، اور عطف الوجود۔

سوال : کیوں سلسلہ خداتے ہوتا ہوا ہے تن لگ

پھر تن کوں کیوں انپڑنا لگ حساب ہو

جواب : یہی نفس ہو دل، روح، سر، نور ذات کہتے

چھ چیزوں جس کا سارا حساب ہے یو

ہند سے خدا تک یعنی نفس سے ذات تک پہنچنے کے لیے ان چھ مراتب سے

گزرنا ضروری ہے جیسا کہ حدیث قدسی، ان فی جہاد آدم نقل کر کے لکھا ہے۔ ان چھ چیزوں میں سے ایک ہے :

سوال : نازل کیا ہے قرآن حق سات حرف اوپر

سات حرف کیا ہے کوئی شیخ شاب ہو

جواب : ہی ہ سو ہو، کہتے نام ل سائل کر

اے کاف مر حرف سواند نقاب ہے یو

ایک آیت ہے۔ انزل القرآن علی سبعة حروف کل کاف و تاء۔ ان

سات حرف کی تشریح مختلف طرح سے کی جاتی ہے۔ عموماً سات حرف سے سبع

قرات مراد لیتے ہیں۔ لیکن بعض نے ان سات حروف کا تعین بھی کیا ہے معظم نے یہی

لے آصفیہ کے نسخے میں معظم کا جواب ہ شعروں میں ہے :

یو ہے سونے دیویم نین کاف لام ہ : ہے کاف مر حرف سواند نقاب ہے یو

دویم سو او میں ہے سین متخلف ہ حسب : ہے سات حرف سوزاں نازل کتاب ہے یو

سات حروف گنائے ہیں، لیکن ان کے باطن پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔

سوال : مجھ کوں دیکھئے سو حق کوں دیکھئے کہے محمد

ہیں کا فراں بھی دیکھئے پس کیا صواب (ثواب) بولو

جواب : ایک وقت پر محمد بولے تھے من رآنی

برحق رسول مجھے ان کو ثواب ہے یو

معظم کہتے ہیں کہ من رآنی میں رسول پر ایمان لانے کی شرط مضر ہے۔ رسول کی بات پر یقین وہی کہے گا جو رسول پر ایمان لاتا ہے۔ اس لیے من رآنی ایمان والوں کے ساتھ خاص ہے۔ دیکھئے کو کفار بھی رسول اللہ کو دیکھتے تھے، لیکن جو رسول کو رسول ہی نہیں مانتا اس کے لیے رسول کے اندر خدا کو دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سوال : دیدار خواب میاں نے حق اپنا کیا ہے

کیوں دیکھنا سو حق کوں تعبیر خواب بولو

جواب : ایک وقت پر نبی نے بولے تھلی مع اللہ

ہونا خفی میں غائب واصل کو خواب ہے یو

نبی کریم مسلم نے فرمایا تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ میں اللہ کے ساتھ ہوتا ہوں اور وہاں کسی فرشتے کی گنجائش ہے اور نہ نبی کریم کی۔ شاہ معظم اسی حوالے سے کہتے ہیں کہ واصل کا اس طرح فنا ہونا ہی کمال معرفت ہے۔

سوال : مل کن خدا عرش کرو یا سو کیا سبب ہے

یو مل کرو مسائل کہو لو کتاب بولو

اسب : دل میں ہیں سات مقادیر اس نے عرش کہا ہے

سب مل کیے مسائل برحق کتاب ہے یو

دہ، یعنی دھرم اور روح کے اندر سببہ صفات ہیں۔ اسی وجہ سے دل کو فرشتہ

کہا گیا ہے۔

سوال : پینا شراب کریں کہ گئے ہیں سب بزرگان

نت نوش عاشقاں کا دو کیا بشارت بولو

جواب : واصل ہمیشہ چیتے اکثر سو سے محبت

سبب عاشقاں کے حق میں یاد پچہ شراب ہے یو

کم و بیش ہر سلسلے میں عشق پر زور دیا گیا ہے۔ یہاں شراب سے مراد عشق الہی اور یاد الہی کی شراب ہے۔

سوال : اسماں زمیں کے میاں لٹا کا کتے ہیں

واصل جو آپ پیتے وہ کیا ہے آب بولو

جواب : لٹا کا کتے سو ہے متنع اندھارا

واصل وہ آپ پیتے سو لطف آب ہے یو

نافذہ امینہ میں مرتبہ متنع الوجود کو اندھارا گھر اور لٹا کنواں کہتے ہیں، لیکن لٹے کنویں کا استعارہ دغور و فکر سے کھل سکا نہ کہیں اس کی تشریح نظر آئی۔

سوال : معبود عبد کے میاں نے کہتے ہیں عشق پروا

بن عشق تو وصل نہیں یو کیا حجاب بولو

جواب : احمد میں جو راہ میں جون ہم کا ہے پروا

یوں عشق ہم ہو کر دستا حجاب ہے یو

معبود سے وصل و اتصال کی آرزو ہی عبد و معبود میں غیریت پیدا کرتی ہے اس لیے کہ عشق اس وقت ہوگا جب مطلوب اور طالب میں غیریت اور فصل ہو گیا۔ شاہ صادق یہ پوچھ رہے ہیں کہ وصال بغیر عشق کے ممکن ہی نہیں اور خدا عشق پروا ہے۔ یہ کیا معاہدہ معظم کہتے ہیں کہ ذات احمد نے جب اپنے کو دیکھنا چاہا تو نزول کیا اور احمد کہلایا۔ احمد

احد کا طالب ہوا اور یہی عشق م بن کر احد اور احمد کے درمیان حجاب بنا۔ صوفیہ طلب حلا میں ترک دنیا، ترک عقی، اور ترک مولا بھی کرتے ہیں۔ اس لیے کہ آرزو خود حجاب بن جاتی ہے۔ شاہ صادق ترک مولا کے اسی مسئلے کی وضاحت چاہتے ہیں۔ لیکن شاہ معظم نے جواب کا انداز بدل دیا ہے۔ وہ عشق کے پردے کو معنی پر حق حقیقت بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ احد اور احمد کے درمیان مہم عشق کا پردا ہے اور یہ پردہ حقیقی ہے۔ یعنی یہ کہ حقیقت ذات باری اور حقیقت محمدی کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ تصوف اور فلسفہ کا ایک اصولی مسئلہ یہ بھی ہے کہ قلب ماہیت محال ہے سیر فی اللہ، للہ، مع اللہ رسول اکرم کے ساتھ خاص بھی جاتی ہے۔ کسی دلی کو یہ سیر میسر نہیں آتی، لیکن سیر کے اس کمال کے باوجود رسول اللہ نے بھی فرمایا کہ ماہر فاضل حق معرفت کے معظم اپنے جواب میں مسئلے کے اسی پہلو کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عشق کا پردا درمیان سے اٹھ نہیں سکتا۔ اولیاء اللہ اس پردے کو اٹھانے کے لیے ترک مولا بھی کرتے ہیں اور ترک ترک بھی، لیکن ان سارے مراحل کے طے کرنے کے بعد بھی عید مہمود نہیں بن سکتا۔ اس لیے کہ یہ قلب ماہیت ہے اور قلب ماہیت محال ہے۔

سوال : میں جانتے اچھے تو بوجہ تینوں سوں جا کے پوچھو

انجان ہو نہ سو گیا اس میں لاپ بولو

جواب : فانی فی اللہ ہوے تو باقی باللہ رہتا ہے

اہم وہ اس جینے کا اتنا چاہ لاپ ہے بولو

آصفیہ کے نسخے میں شاہ صادق کا سوال تو ہے لیکن شاہ معظم کا جواب نہیں ہے۔

راقم الخوف کے ملوک نسخوں میں جو شعر جواب معلوم ہوتا ہے وہ اوپر نقل کیا گیا ہے۔

اس شعر کا تفسیر بھی یہی ہے جو سوال و اسے شعر کا ہے۔ لیکن سوال و جواب میں کوئی ربط

نہیں معلوم ہوتا۔ جلد سچ تو یہ ہے۔ شاہ صادق کے شعر میں کی نام مسئلے کے نام سے

استفسار ہی نہیں ہے۔ ہر ایک یہی کہتا ہے کہ اگر تم نہیں جانتے تو کسی جاننے والے سے علم حاصل کرو۔ اس لیے شاہ صادق کا سوال کیا ہے یہی واضح نہیں ہوتا۔ معظم نے جواب میں جو بات کہی ہے اس کا کوئی تعلق شاہ صادق کے سوال سے (اگر وہ سوال ہے) نہیں معلوم ہوتا۔ شاہ صادق کے سوال نامے کا آخری شعر یہ ہے :

شیوخ ظاہری سب شہرت اٹھائے ہیں کر

سائل ہوا ہے صادق کس کو جواب بولو

اور معظم کا جواب حسب ذیل ہے :

قادر رحم کرم کر بولیا منجھے معظم

صدقہ امین علی کا تجر پر خطاب ہے بولو

شاہ صادق آخر میں کہتے ہیں کہ لوگ بڑے بڑے شیوخ اور اہل دینی بیٹھے ہیں، ان میں سے کوئی تو میرے سوالوں کا جواب دے۔ اس طرح شاہ صادق دعوت مبارزت کے انداز میں گویا صلائے عام دے رہے ہیں۔ آصفیہ کے نسخے میں شاہ صادق کے آخری شعر سے پہلے ایک اور شعر ہے جو راقم الخوف کے نسخوں میں نہیں ہے :

قادر ہوا ہے شہرت لے کر اٹھا ہے یوں کر

کوئی حل کرو مسائل اس کا جواب بولو

اس شعر کا پہلا مصرع صاف نہیں ہے تاہم یہ مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ جو لوگ قادر کی بزرگی اور ان کے فیضان کا بار بار ذکر کرتے ہیں وہ ہمارے سوالوں کا جواب دیں، تو ہم بھی مائیں یا پھر راست قادر (قادر لنگا کوتال) سے مخاطبت بھی ہو سکتی ہے۔

معظم نے اپنے جواب میں ذرا تو نقلی کی ہے اور نہ مبارزت طلبی کا جواب دیا ہے، جس سے ان کے مزاج اور افتاد طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ حسب عادت آخری شعر میں اپنے طبع کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قادر نے میرے حال پر رحم کر کے مجھے معظم کے نام سے سرفراز کیا ہے اور

یہ صدمہ امین علی کا ہے۔

میں بعض جواب ایک شعر میں، بعض دو شعر میں اور بعض تین شعر میں دیے گئے ہیں۔

ان زاید اشعار سے جواب زیادہ واضح ہو گئے ہیں۔

اس نسخے میں بعض دوسرے نسخوں کی طرح سوال و جواب کی ترتیب بھی بدلی ہوئی ہے، لیکن ہر نسخے کی یہ مشترکہ خصوصیت ہے کہ سوال بھی ترتیب سے نقل ہوئے ہیں جواب بھی اسی ترتیب سے نقل کیے گئے ہیں۔

بازیافت

سوال صادق اور جواب معظم کا ایک اور نسخہ (۱۶۹ فلسفہ کتب خانہ آصفیہ میں دست یاب ہوا ہے، جس میں صادق اور شاہ معظم کے اشعار کی تعداد (۳۳) ہے۔ اس نسخے کی کتابت کا انداز بھی بدلا ہوا ہے۔ دوسرے تمام نسخوں میں صادق کی غزل (سوالات) پہلے اور شاہ معظم کی غزل (جوابات) اس کے بعد نقل کی گئی ہے، لیکن اس نسخے میں سوالات اور جوابات کو الگ الگ لکھنے کی بجائے ہر سوال کے ساتھ اس کا جواب لکھا گیا ہے۔

کتب خانہ آصفیہ کے نسخے (۲۷۵۹ جدید) میں صادق کے اشعار کی تعداد بارہ اور شاہ معظم کے اشعار کی تعداد گیارہ ہے۔ راقم الحروف کے ملوک نسخوں میں سے ایک میں صادق اور معظم کے اشعار کی تعداد گیارہ گیارہ ہے اور دوسرے نسخے میں صادق کے اشعار گیارہ اور معظم کے اشعار کی تعداد بارہ ہے۔ صادق اور معظم کے بارہوی شعر کی نشان دہی پچھلے صفحات میں کی جا چکی ہے۔ زیر نظر نسخے میں صادق کے اشعار کی تعداد گیارہ ہے اور معظم کے اشعار کی تعداد بائیس ہے، جن میں راقم الحروف کے دوسرے نسخے کا بارہواں شعر بھی شامل ہے۔ اس طرح زیر نظر نسخے میں دس شعر ایسے ملتے ہیں جو کسی دوسرے نسخے میں نہیں ملتے۔

دوسرے نسخوں میں سوال بھی ایک شعر میں ہے اور جواب بھی ایک شعر میں لکھا گیا ہے۔ صرف آصفیہ کے نسخے میں ایک جواب دو اشعار میں ہے، لیکن زیر نظر نسخے

سی حرفی

چند اصناف سخن و داستان و کھن کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان میں چکی نام، سہیلا، حقیقت کھاڑا اور سی حرفی قابل ذکر ہیں۔ سی حرفی وہ نظم ہے، جس کا ہر مصرع یا ہر شعر ترتیب وار حروف تہجی کے نام سے شروع ہوتا ہے اور جس حرف کے نام سے مصرع یا شعر شروع ہوتا ہے وہی اس مصرعے یا شعر کے پہلے لفظ کا پہلا حرف بھی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی حروف تہجی کے نام کو حذف بھی کر دیا جاتا ہے اور صرف یہ التزام رکھا جاتا ہے کہ ہر مصرعے کے پہلے لفظ کا پہلا حرف، حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ آتا ہے۔

سی حرفی بالعموم شغوی کی حیثیت میں ملتی ہے، لیکن بعض نظمیں ترجیع بند اور ترکیب بند کی حیثیت میں بھی لکھی گئی ہیں، جو نظمیں ان پشتوں میں لکھی گئی ہیں، ان میں ہر بند کا پہلا مصرع ترتیب وار نئے حرف سے شروع ہوتا ہے۔

عربی حروف تہجی اگرچہ (۲۸) ہیں، لیکن خانوادہٴ ہائبر کے صوفیہ نقطہ اور لا کو بھی بطور حروف شامل کر کے تعداد حروف کو تیس تک پہنچاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے نظام فکر میں نقطہ اور لا کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور بغیر ان کے حروف تہجی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ نقطہ اور لا کی اہمیت اور فضیلت شاہ برہان الدین جامی کی تعلیمات کا حاصل ہے۔ چنانچہ شیخ محمود غزنوی دہلوی رسالہ معرفت السلوک میں

ان تعلیمات کی ترویج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اُسے سالک وہاں کہ دریں اصطلاح مرتبہ حرف لام الف از مرتبہ بعض حروف ہا بالا تراست و ای حرف لا تعریف نقطی کند مدح نقطی گوید کہ چہ لطافتی و غرافی است۔ مرتبہ را کہ بیچ حروف مغزوات خواہ مرکبات و دوسے اظہار نیستند و مخفی اند بقا ہلیات کہ اخلوج حقیقا ازل قابلیت است بلکہ ان قابلیت در نقطہ عین نقطہ است بلکہ در اں قابل قابلیت را نیز بیچ وجودے نیست بحر وجود نقطہ لاتعین پس ایں حروف لا از تعین نقطہ گراہی می وہ کہ بحر نقطہ بیچ تعینی نیست یعنی ذات نقطہ بالوجود خود خواستہ

حرف لا اور ازل کلام حق بود یہ معنی آنکہ نیست بحر من بیچ کس ازیں معنی وہ حرف لا را لام الف محبت کرہن و بہ معنی نفی۔ بنا بر آں انحضرت ویر و سنگیر اقدس اللہ سرور العزیز حرف لا را بر جملہ حرف ہا منسوب کر دیند..... پس انحضرت با حرف لام الف را بنا بر آں بر سر جملہ حروفات فرشتہ اند.....

پس بدانکہ جو اصطلاح وجود حروفات کہ بست و ہشت اند ظہور ایشان را جملہ از نقطہ دیدند و نقطہ را از جملہ منزہ یافتند

شاہ برہان الدین جامی نے حرف تہجی کو چار وجودوں پر تقسیم کر کے ہر وجود کے ست

- | | |
|----|---|
| ۱۔ | شیخ محمود غزنوی دہلوی، رسالہ معرفت السلوک، مخطوط، ملوکہ راقم الحروف |
| ۲۔ | شیخ محمود غزنوی دہلوی، رسالہ معرفت السلوک، مخطوط، ملوکہ راقم الحروف |
| ۳۔ | شیخ محمد غزنوی دہلوی، رسالہ معرفت السلوک، مخطوط، ملوکہ راقم الحروف |
| ۴۔ | شیخ محمود غزنوی دہلوی، رسالہ معرفت السلوک، مخطوط، ملوکہ راقم الحروف |

حروف بتائے ہیں۔ اس تقسیم کی وضاحت کرتے ہوئے محمود خوش دہاں نے لکھا ہے :
 "اے سالک کلام حق بہ ایسی حروفات و اظہار آہد ہیں معنی بود کہ جملہ کلام
 سبحانہ بابت و ہشت حروف نام گشت۔ چنانچہ ظہور قرآن خارج
 ازین بست و ہشت حروف نیست۔ ہم چنین ظہور عالم خارج از بست
 و ہشت مراتب نیست۔ چنانچہ در دائرہ جام جہاں نمانوشدہ است۔
 و این مراتب عالم کتاب عظیم اوست۔ چنانچہ مولانا مفری گفتہ :

عالم بخط دوست کتابست و لیکن
 ادراک درونی نہ کند دیدہ اعمیٰ

پس ذات الٰہ سبحانہ در ظہور خود بہ بست و ہشت مرتبہ نمودہ می آید باوجود
 چہار در اصطلاح آن حضرت مائدہ س اللہ سرہ العزیز بست و ہشت
 حروف را بہ تقسیم چہار وجود کردہ اند بہ ہفت حروف۔ پس ان ہفت حروف
 اولیں کہ از الف تا خی اند در دائرہ عارف الوجود ثابت کردہ شدہ است۔
 زیرا کہ در دائرہ عارف الوجود ہفت مرتبہ اند بجز حروف لا۔ ہفت حروف
 اولیں را در تقسیم عارف الوجود کردہ ہفت حروف دوی را بہ قسمت بہ متبع
 الوجود، و ہفت سوئی را بہ ممکن الوجود، و ہفت حروف چہارمی را بہ لازم الوجود
 آں چنان کہ اگر چہ در دائرہ واحد الوجود نیز بجز لا ہفت مراتب اند، اما آن در
 تحت لا اند۔ پس در ہر دائرہ ہر ہفت حروف کہ در آن دائرہ اند دلالت کن
 بر آن مرتبہ کی کنند تا حرف ی کہ آخر مراتب است۔

اس طرح (۲۸) حروف کو چار مراتب پر تقسیم کر کے ہر حرف کا ایک شخصی معنی ہے
 مندرجہ بالا اعتبارات سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ کسی حرفی میں اٹھائیں روف

۱۔ شیخ محمود خوش دہاں۔ رسالہ معرفت السلوک محفوظ ملک راقم الحروف

کے علاوہ نقطہ اور لا کو کیوں شامل کیا جاتا ہے اور ان کی کیا اہمیت ہے۔ ان حروف کا
 خاوندہ اہمیت یہ کہ ان کے نظام تصوف میں وہ کیا مقام رکھتے ہیں۔ اس
 لیے کہ اس کے بغیر نظم سی حرفی کی اصطلاح سمجھ میں آ سکتی ہے، نہ اس کی ہیئت کا اندازہ
 ہو سکتا ہے، نہ اس کے مخصوص مضامین تک ذہن منتقل ہو سکتا ہے اور نہ ہیئت اور مضمون
 کے گہرے ربط پر نظر جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صنف اب تک ایک سماجی روی
 اور کسی نے اس کی ہیئت، اصل، مضمون اور مضامین کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں
 لکھا ہے۔

اس صنف میں بعض ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن میں پ، ت، ج اور ڈ کو شامل کر کے
 حروف کی تعداد (۳۴) تک پہنچا دی گئی ہے۔ ایسی نظمیں محض جدت طبع کی پیداوار معلوم ہوتی
 ہیں۔ اس لیے کہ یہ صنف ایک مخصوص نظام فکر کی پیداوار ہے، اشار کی تعداد میں تو کمی بیشی
 ہو سکتی ہے لیکن حروف کی تعداد میں کمی بیشی سے وہ نظام فکر ہی درہم برہم جو جاتا ہے، جس نے
 اس کو جنم دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان شعرا نے جن کا تعلق خاوندہ اہمیت سے ہے کبھی حروف
 کی تعداد میں اضافہ نہیں کیا ہے، البتہ ایسی نظمیں ضرور ملتی ہیں، جن میں صرف اٹھائیس حروف ہیں
 نقطہ اور لا کو حذف کر دیا ہے، لیکن اس سے نظم کی معنویت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس لیے کہ
 ان نظموں میں واجب الوجود سے عارف الوجود تک بیان پر اکٹھا کیا گیا ہے، واحد الوجود اور
 اس کے آگے کے مرتبہ پر طبع آزمائی نہیں کی ہے۔

قرابی سے پتا چلتا ہے کہ یہ صنف شاہ برہان الدین جامی کی دینا ہے۔ ارشاد نامے
 کے آخری حصے میں اس صنف کے ابتدائی خط و خال کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے ارشاد نامے
 میں علم کسی اور علم لدنی کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے :

علم لدنی نکتہ جان ۱۔ وہی ہے نکتہ دیکھ بچھان
 ایسا نکتہ وہ ہے بار ۲۔ ظاہر باطن دیکھن بار

ہر ایک حرفوں نکتہ جان ۛ ناٹن نشان تو پورے عیاں
 بن حرف نکتہ کہاں ہے شمار ۛ بن نکتہ حرف کہاں ہے بار
 کہ اول نکتہ الف سیر ۛ رکھ کر نکتہ کھینچے گیر
 وہ تو نکتہ احد نیک ۛ ب کا نکتہ محمد یک
 ت کا نکتہ مرید مرار ۛ باو میں نکتہ کروں سواد

اسی طرح ث، ج، خ، ف، ق، ر، ش، ن اور ی کی وضاحت کی ہے،
 لیکن اس وضاحت میں نہ تو پورے حروف تہجی شامل ہیں اور نہ ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے
 بعض حروف کی وضاحت ایک سے زائد بار بھی کی ہے۔ اگرچہ جانم نے پورے حروف
 تہجی کی تشریح نہیں کی ہے، لیکن حسب ذیل شعر سے صاف ظاہر ہے کہ تمام حروف تہجی
 کے مفہم ان کے ذہن میں تھے :

نکتے کا ہے دیکھ صرف ۛ یک کم تیس حرف

کلمۃ الحقائق میں بھی حروف تہجی کی بحث علم کسی اور علم لدنی ہی کے سلسلے میں آئی ہے
 "علم دو است، یکے کسی، دوم علم لدنی، و علم کسی چیز سے کہ در قلم در آید
 و علم لدنی کہ در قلم نیاید، آن علم لدنی، چنانچہ العلم نقطہ، آن نکتہ کہ نام
 است، ذات منزہ باری تعالیٰ کہ عالم الغیب و الشہادت، آن نکتہ
 قدیم است کہ از نکتہ او ہمہ نکات ہاز آمدند ہر حرف تمام تا نام و نشان
 عیاں شد کہ ہمہ قدرت آشکارا شد، جان و جہانیاں تشبیل نظیر نمود
 چنانچہ نکتہ ابتدا از الف است کہ عالم الغیب و الشہادت، و از
 نکتہ احد نکتہ ب احمد شد کہ من رانی فقد رانی الحق و نکتہ ت از ب

مرید است

اسی طرح ث، ج، خ، ذ، ز، ش، ض، ظ، ع، ف، ق اور ی کی تشریح
 کرتے گئے ہیں۔ اسی سلسلے میں لکھا ہے :

"اما نکتہ بر دو جا باشد یعنی محقق و یک جا اظہار کہ ہو اظہار ہو الباطن
 و لیکن جز نکتہ یک کم سی حرف بار نمود لیکن نکتہ منزہ است"۔

ارشاد نامے اور کلمۃ الحقائق میں تو پورے حروف تہجی کی تشریح نہیں ملتی لیکن جانم
 نے اپنی ایک نظم میں اس کا اہتمام کیا ہے، غالباً ہی اس ڈھنگ کی پہلی نظم ہے۔ یہ
 نظم (۱۶) ابیات پر مشتمل ہے۔ پہلے شعر کا پہلا مصرع نکتے سے اور دوسرا مصرع الف
 سے شروع ہوتا ہے :

نکتا ہو کہ جب لگ تختا تب لگ نہ تھا عیاں

الف اس نکتے سے ہو بیٹھا و سنے لا گیا عیاں

جودہ شعروں تک یہی التزام رکھا ہے کہ ہر مصرع ایک حرف سے شروع ہوتا ہے
 لیکن پندرہویں شعر کا دوسرا مصرع "سی" سے شروع ہونے کی بجائے سولہویں شعر کا پہلا
 مصرع "سی" سے شروع ہوتا ہے۔ پندرہویں اور سولہویں شعر سبب ذیل ہے۔

لا کا لکھا دیکھیں تو تجھ لکھا تھا ہے

اس لکھے میں ہے کوئی لکھے دس سو ہی پاوے

ی یقین یہاں جس بوے جاں بھی نہیں جان

والسلام میں اُن کو گناہ ہے پُر نور ایمان

۱۔ شاہ برہان الدین جانم، کلمۃ الحقائق (مرتبہ، اکبر الدین صدیقی) صفحہ ۱۰۸

۲۔ شاہ برہان الدین جانم، کلمۃ الحقائق (مرتبہ، اکبر الدین صدیقی) صفحہ ۱۱۰

۳۔ یہ نظم کتب خانہ انجمن ترقی مدد و ہدایہ (ایکسپریس رسالہ ۵۴) میں شائع ہے۔

مولوی عبدالحق نے شاہ برہان کی منظومات میں اسی دھنگ کی وہ نظموں کا ذکر کیا ہے۔
ان میں سے ایک نکتہ داغ ہے اور دوسری کا کوئی عنوان نہیں ہے۔ ان نظموں کے بارے میں
میں وہ لکھتے ہیں:

یہ نظم بارہ شعر کی ہے جس میں توحید کی تلقین ہے اور ہر حرف اجد سے
کوئی لفظ بنا کر ہدایت فرمائی ہے۔ پہلا شعر ہے:

نکتہ واحد ابی ادر ہے الف ذات صدقہ ہے
ب بدو پ کر آئیں ایک تمام پر گٹ لیکھ
(ہر وہ)

اسی طرح "ی" تک لکھتے چلے گئے ہیں۔

اسی کے ساتھ دوسری نظم بھی اسی قبیل کی ہے۔ اس میں بھی ہر شعر کی ابتدا میں
حرف اجد ہے اور اس سے لفظ لے کر شعر کہے، مثلاً:

الف ایمان اللہ پر لیاؤ اُن سب جگ نہایا

ایسی قدرت نہ بھانت دچیا آئیں آپ چھپا!

ز زینت دنیاں کا چھوڑی ذمت جائے نکاح

زیادتی توہت نہ آدیے نہیاں انہڑے پاس

اس میں کل انیس شعر ہیں۔ عربی حروف اجد اٹھائیس ہیں۔ لیکن آخر میں

ایک شعر "پ" کا اور بڑھا دیا ہے۔ وہ ہے:

پ پودا جے طالب جو ہے پر نور اس کا دل

پلک پندشاہ برہان آگے پیارے حق کا واسلہ

رسالہ امداد بابت ماہ جولائی ۱۹۲۲ء صفحہ ۵۲۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ "پ" سے
شروع ہونے والا شعر اخلاقی ہے۔

اب معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق سی حرفی کی صنف سے واقف نہیں تھے۔ اس
لیے انہوں نے نہ تو ان نظموں کو "سی حرفی" کا نام دیا ہے اور نہ اس صنف کے بارے میں
کچھ لکھا ہے۔

افسر صدیقی نے شاہ برہان کی ایک اور سی حرفی کا ذکر کیا ہے جو ترجیع بند کی ہیئت
میں بھی گئی ہے:

اس سی حرفی کا نام فہرست مخطوطات میں "نفاذ شاہ برہان" لکھا گیا ہے

شاہ برہان نے اپنی سی حرفی کو ترجیع بند کی صورت میں لکھا ہے کل

(۱۲) بند اور (۲۸) مصرعے ہیں۔ ہر بند کے آخر میں ایک مصرع

پیا نکتہ پر گٹ آج جھیا

کی تکرار ہے۔ خاص بات اس سی حرفی میں یہ ہے کہ "الف" آخری بند

میں ہے جب سے ابتدا کی گئی ہے اور "لا" کو ایک حرف تصور کیا

گیا ہے مثال کے طور پر ایک بند لکھا جاتا ہے:

ج جیو میں میرے تو نہیں ہے ۹ حاصل مرشد بان کسے

خ خلوت میں توں آپ دے ۱۰ پیا نکتہ پر گٹ آج جھیا

شاہ برہان کی پیروی میں ان کے سلسلے کے اکثر شاعروں نے سی حرفی بھی ہے جن میں
شیخ محمود خورشید، شاہ کریم، شاہ معظم، شاہ تراز، اور شاہ کمال قابل ذکر ہیں۔

۱۔ رسالہ امداد بابت اپریل ۱۹۲۲ء صفحہ ۲۹

۲۔ مخطوط کتب خانہ راقم الحروف

۳۔ مخطوط کتب خانہ دارالعلوم امین الدین علی اعظمی، بیجاپور

۴۔ شاہ معظم کی اس نظم کے نسخوں کی تفصیل آگے آئے گی۔

۵۔ شاہ تراز کی یہ نظم ان کے دوسرے کلام کے ساتھ کتب خانہ شاہی ترقی ادب و سہ دہلی میں محفوظ ہے

۶۔ کتب خانہ راقم الحروف

شعریں۔

شاہ معظم خانوادہ امینیہ کے سربراہ اور شاعر ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اپنے خانوادے کی اس مخصوص صنف میں طبع آزمائی نہ کرتے۔ چنانچہ انہوں نے بھی سی حنفی کبی ہے، جس کے نسخے اکثر کتب خانوں میں مل جاتے ہیں۔ راقم الحروف کو جو نسخے دست یاب ہو سکے ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد

مخطوط نمبر (۵۱)، تعداد صفحات (۵)، تعداد اشعار (۲۸)۔

یہ نسخہ حضرت امین کے مخطوطات اور ادکارہ اشغال کے ساتھ ایک مجموعے میں شامل ہے جو انتہائی کم خوردہ اور لاسیدہ ہے۔ اس نسخے کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر شعر کے نیچے ایک آیت، حدیث یا قول نقل کیا گیا ہے۔ اکثر آیات کا مطلب وہی ہے جو ان کی ذیل میں دی ہوئی آیت، حدیث یا قول کا ہے۔ لیکن بعض جگہ یہ معنوی ربط مفقود بھی ہے۔ شتوی کا عنوان درج نہیں ہے لیکن شاعر کا تخلص اور اس کے شیخ کا نام موجود ہے۔

۲۔ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد

مخطوط نمبر (۶۶)، تعداد اشعار (۲۰)، تعداد صفحات

یہ نسخہ ایک بیاض میں شامل ہے جو سال ۱۲۱۱ ہجری کی مکتوبہ ہے۔ اس بیاض میں دیکھی کے ان شعرا کا کلام درج ہے جو گول کلمہ ادبی جاوید کے نذال کے زمانے میں گورے

نسخہ ناقص الآخر ہے۔ کاتب نے 'ف' کے شعر پر شتوی ختم کر دی ہے، عنوان

سی حنفی لکھا ہے۔

۳۔ کتب خانہ اکھفہ، حیدرآباد

مخطوط نمبر (۱۸۲۹) جدید، تعداد صفحات (۳)، تعداد اشعار (۳۰)
 لوح پر بیضا، الحمد للہ الرحمن الرحیم کے بعد حضرت امام علی موسیٰ رضا رسالہ معظمہ
 لکھا ہے۔ عنوان درج نہیں ہے۔

۴۔ کتب خانہ اکھفہ، حیدرآباد

مخطوط نمبر (۳۱۱۷) تصوف، تعداد صفحات (۵)، تعداد اشعار (۲۹)
 ایک ضخیم بیاض میں، جس کا شیرازہ بکھر چکا ہے، یہ شتوی شامل ہے۔ سرنامہ اور
 ترتیب نہیں ہے۔ ادارہ ادبیات کے نسخے (نمبر ۵۱)، کی طرح اس نسخے میں بھی ہر شعر کے
 نیچے کوئی حدیث، آیت یا قول درج ہے۔

۵۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ، حیدرآباد

مخطوط نمبر (۱۴۹) تصوف، تعداد صفحات (۲)، تعداد اشعار (۳۰)۔
 آزاد نامہ، گفتار معظم، تصدیق معظم اور حصیت الہامی کے ساتھ یہ شتوی شامل
 ہے اور آزاد نامے کے بعد الف نامہ کی سرخی کے تحت لکھی گئی ہے، غالباً نصیر الدین شہکی
 مرحوم نے یہ عنوان نہیں دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے 'الف نامے' کے خاتمے کے اشعار
 کو آزاد نامے کے خاتمے کے اشعار بتایا ہے۔

۱۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ کی اردو قلمی کتابیں کی رضا حق فہرست، صفحہ ۲۰۰

۶۔ کتب خانہ پروفیسر آغا حیدر حسن، حیدر آباد

تعداد صفحات (۵)، تعداد اشعار (۳۰)

یہ نسخہ ایک قدیم بوسیدہ اور کم خوردہ بیاض میں شامل ہے، جس کے اکثر اوراق ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہو گئے ہیں۔ مثنوی کا کوئی عنوان درج نہیں ہے۔

۷۔ کتب خانہ قادر بادشاہ صاحب، حیدر آباد

تعداد صفحات (۳)، تعداد اشعار (۲۰)

نسخہ پر کلام معظم لکھا ہے۔ کوئی ترقیم نہیں ہے۔ البتہ سنہ کتابت ۱۲۶۱ھ ہجری درج ہے۔

۸۔ ۹۔ ۱۰۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

کتب خانہ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی، میں اس مثنوی کے تین نسخے ہیں۔ پہلا نسخہ مخطوط نمبر (۷۵)، تصوف میں، دوسرا نسخہ مخطوط نمبر (۷۶)، تصوف میں اور تیسرا نسخہ دیوان معظم (مخطوط نمبر ۱۷۷) میں شامل ہے۔ نظم کا عنوان کسی نسخے پر درج نہیں ہے۔ فہرست نگار مخطوطات انجمن ترقی اردو نے "مثنوی معظم (حروف تہجی)" کا نام دیا ہے۔ پہلے اور دوسرے نسخے میں اشعار کی تعداد (۲۹) اور تیسرے نسخے میں (۳۱) ہے۔

۱۱۔ کتب خانہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی، بمبئی

تعداد صفحات (۳)، تعداد اشعار (۲۹)

کلمۃ الاسرار، چھ پر بار وغیرہ کے ساتھ ایک مجموعے میں سی حرفی کا یہ نسخہ بھی شامل ہے۔

مرزا مہ اور ترقیم نہیں ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھ کر مثنوی نثر کی طرح نقل کی ہے۔ کم و بیش ہر شعر کے بعد ادارہ ادبیات اردو (مخطوطہ نمبر ۷۵۱) اھ کتب خانہ اصفیہ (۲۱۱۷) تصوف کے نسخوں کی طرح کوئی آیت، حدیث یا قول درج کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں فارسی جملے اور فقرے بھی ہیں۔

اس مجموعے کے تمام رسائل ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے ہیں۔

۱۲۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، پاکستان

اس نسخے کا ذکر افسر صدیقی نے اپنے مضمون "سی حرفی معظم" میں کیا ہے اور اس کو رسالہ اردو (پاکستان) بابت اپریل ۱۹۶۶ء میں چھاپ دیا ہے۔ تعداد اشعار (۳۰) ہے۔

اس مثنوی کے صرف (۳) نسخوں پر عنوان درج ہے۔ نسخہ نمبر (۷۶۶) ادارہ ادبیات اردو پر سی حرفی، نسخہ (۱۳۹) تصوف کتب خانہ نواب سالار جنگ پر "الف نامہ" اور نسخہ کتب خانہ قادر بادشاہ پر "کلام معظم" لکھا ہے۔ کلام معظم غالباً کاتب نے اپنے طور پر لکھ دیا ہے۔ یہ مثنوی کا عنوان نہیں ہو سکتا۔ اب رہ گئے دو عنوان "سی حرفی" اور "الف نامہ" جن کو یہ نظم اس صنف سے تعلق رکھتی ہے جس کو "سی حرفی" کہا جاتا ہے۔ البتہ اس کا عنوان "سی حرفی" بھی ہو سکتا ہے، لیکن اس عنوان کی حیثیت عمومی ہے جس سے صنف متعین ہوتی ہے۔ اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ اس عمومیت میں تخصیص پیدا کرنے کے لیے شاہ معظم نے "الف نامہ" کا عنوان دیا ہوگا۔ اس قیاس کو تقویت اس سے بھی ہوتی ہے کہ مثنوی "نقطے" نہیں "الف" سے شروع ہوتی ہے۔ سی حرفی کے موضوع اور مضامین کے بارے میں ابتدائی سطور میں اظہار خیال کیا جا چکا ہے اس لیے زیر نظر نظم کا موضوعاتی جائزہ تحصیل حاصل ہے۔ ذیل میں پوری

مثنوی نقل کی جاتی ہے

الف احمد میں مثنوی تھا سوشوقوں باہر آیا

حرف حرف میں دھپ بدل کر تیم گنگوٹ لایا

ب بانہ یار شدہ روز ازل سوں عشق محبت گل میں

سین کو حق کا پیہم پیسا را عاشق ہوئے یں میں

ت تعلیم جنو کو تہیں دیتا اُن کا شوق بندھارا

من عرف کرفی کوں پاوے عارت عاشق سارا

ث ثانی اُس کا کوئی نہیں ایک وہی ہے رازق

سہرہم کرم اُس کا سب پر وہ جگہ کا ہے خالق

ج جمالت یو سب اُس کا جو کچھ تہ کوں دوتا

اول آخر ظاہر باطن کیا خالق کیا رب

ح حق کو سمجھو جو کچھ دیکھو مطلق اُس کو کہتے

واصل حق سوں قائم دائم اُن کیوں اچھتے

خ خبر یو اُن سوں پانا جن کوں پر کیا ہے

ترجیح کیرا پور خانا جن کے بات دیا ہے

د دلیل یو حق نے تجھ پر قائم جھت بھیجا

یصال اندھا سوں اندھا ہے رویت تحفہ لے جا

ذ ذاکر اچھنا ہر دم، ذکر فسر میں رہنا

شہادہ شہود ہو کر رہتے واصل اُن کو کہنا

ر راضی رہنا حق پر اپنے، صابر ہو کر کشاکش

خیر شر سب اس سوں باز نہیں تو ہونا کافر

ز زینت تیرا بندگی طاعت و رسول شرع محمد

زمن کیا ہے حق نے تجھ پر بولے آپ محمد

س سلوک کی راہ دکھاتے اُن کوں کہتے سالک

چاروں منزل طے کراتے اُن کوں کہتے مالک

ش شہادت چاروں حق سوں چاروں کو بوجے

باٹ پرت کی مفت نہیں بے مرقے مرقوں بوجے

ص صابر رہنا جو رجھا پر تسلیم ہو کر دائم

عاشق صادق اس کو کہتے عبد الست پر قائم

ض ضرب تو دیتے رہنا نفس وندے کوں ہر دم

مجاہدے سوں کو شش کرنا تو کیا ہے اس کا غم

ط طالب صادق اچھنا تو توں مطلب پاوے

صادق کو ہے راحت کہتے کاذب کھویا جاوے

ظ ظلم توں اُس پر کرنا جس پر آیا حد

دشمن تیرا نفس امارہ اُس کوں کرنا رد

ع عنایت حق نے کیتا تجھ پر دین نبی کا

چاروں رو چل کو جانا جیوں ہے امر ربی کا

غ غزا پر قائم اچھنا دائم چڑ کر تازی

تجربہ ہو کر تفرید رہتے ان کو کہتے غازی

ف فاقد لینا حق پر اپنا دینا فنا میں اول

چالیں چالیں فاتحے کرتے نبی ہمارے مرسل

ق قناعت بڑا خزانہ جن کوں حق آپنی دیتا
 دو عالم کوں نہیں خاطر لیا تے ان کوں مالک کیتا
 ک کفر کا پردہ توڑو جو دیکھو چاند پیٹم کا
 اوس کے عینوا دس کوں دیکھو کھول گھونگھٹ پیٹم کا
 ل لطافت اوس کی میری اور نہیں کوئی دو مرا
 اوس کے میرے مینا نے کہتے عشق مشاطہ سرا
 م مراتب عالی در جا دو سوں قرب مقام
 لاہوت مینا نے ٹھانا کر داصل رہیں مدام
 ن نورانی نور نبی کا گل شے جس سوں بار
 ریح میں کیوں ہے نور نبی کا اس کوں دیکھ بچار
 و ولایت جاری چشمہ بولے شاہ ولایت
 خواں خمس سوں دل کوں دھونا توں پاوے ہدایت
 ہ ہدایت آپیں کیتا آپیں تقصیر لیتا
 فعل مختاری لینا تجھ پر تو توں حق کوں بھاتا
 لام لاف مل ایک ہوا ہے کیوں کر کھولا جاوے
 قادر جس پر کرم کرے تو راز رُمز وہ پاوے
 ی یقین جب کیا معظم تب یو خطاب پایا
 جیسا جس کا قال اچھے گا ویسا اُس کا مایا
 والسلام حق نے بھیجیا تو بھی بھیج مدام
 حق کا پیارا نبی محمد بھیج درود سلام

معراج نامہ

معراج کا موضوع دکنی شعرا میں بہت مقبول رہا ہے۔ چنانچہ مشنوں کے تہیدی
 حصوں میں رسول اکرم صلی علیہ وسلم کی نعت لکھتے ہوئے اکثر شعرا نے معراج کے واقعے پر بھی
 جی کھول کر غامد فرسائی کی ہے۔ بعض شعرا نے اس موضوع پر قصیدے بھی لکھے ہیں، جن
 میں نصرتی کا قصیدہ جس کو چرخیات میں شامل کیا جاتا ہے، اپنا جواب نہیں رکھتا۔
 معراج نامے ان کے علاوہ ہیں۔
 قدیم معراج نامے جو دست برد زمانہ کے ہاتھوں سے محفوظ رہ سکے ہیں بلاتی معظم
 ہاشمی سلطان مختار اور قاضی شمس کی تصنیف ہیں، اور گیارہویں صدی کے نصف آخر سے
 تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں بلاتی کا معراج نامہ غالباً سب سے قدیم ہے، جس کا سنہ
 تصنیف ۱۰۶۵ھ ہجری ہے، اور یہ کسی فارسی معراج نامے کا ترجمہ ہے۔

- ۱۔ مولوی عبدالحق نصرتی، معراج نامہ، ۲، اس قصیدے کا ایک نسخہ کتب خانہ نجی محل میں، اور دوسرے
 کتب خانہ انجمن ترقی اردو، پاکستان میں ہیں۔ ایک اور نسخے کا ذکر مولف گل رمانا نے کیا ہے۔
 ۲۔ ملاحظہ ہو، مولوی عبدالحق کامفیون، مندرجہ سالنامہ کاروں، بابت ۱۹۳۲ء
 ۳۔ فہرست مخطوطات، انجمن ترقی اردو، پاکستان، جلد اول، صفحہ ۴۴۴
 ۴۔ فہرست مخطوطات، انجمن ترقی اردو، ہند، اردو ادب، جولائی، ستمبر ۱۹۵۴ء، صفحہ ۱۸۲
 ۵۔ ملاحظہ ہو، مولوی سخاوت مرزا کامفیون مندرجہ نوے ادب، بمبئی، اکتوبر، ۱۹۵۶ء
 ۶۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، صفحہ ۷۵۳

قصہ ہر بواسطہ خلق میں عجیب : کیا چاند شش میں سو ماورجہ
ہزار ایک شیخ شفت تھیں سال میں : سواتوار کے روز طوش حال میں

کہ معراج نامے کی سن یو خبر : حکایت جو بولا ہوں میں مختصر
کیا فارسی کو سو دکنی غزل : کہ ہر عام ہور خام سمجھیں نکل
بلاقی کے ٹھیک پانچ سال بعد شاہ معظم نے اپنا معراج نامہ تصنیف کیا :
یونامہ جہاں میں ہوا جب ختم : اگیار اصدی میں اٹھ تیس کم
رجب کی ستاوین یونامہ تمام : نبی پر ہزاروں دود و سلام
یہ معراج نامہ ترجمہ نہیں طبع زاد ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ شاہ معظم کا معراج نامہ
اردو کا پہلا طبع زاد معراج نامہ ہے۔

شاہ معظم کے معراج نامے کا ایک نسخہ کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں محفوظ ہے جو
(۲۸) صفحات اور (۱۹۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ ایک قدیم اور انتہائی کرم خوردہ نسخہ
ہے۔ عنوانات صریح روشنائی سے لکھے ہیں۔ سرنامہ نہیں ہے، البتہ ترقیم موجود ہے:

”کاتب المودف فقیر حقیر یوسف علی ۲۰ جمادی الثانی سنہ ۱۲۸۰ ہجری“
ترقیمے کا سنہ درست نہیں معلوم ہوتا، اس لیے کہ جس مثنوی کا سنہ تصنیف
سنہ ۱۲۸۰ ہجری ہوا اس کا سنہ کتابت سنہ ۱۲۸۰ ہجری کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ اسی خیال
کے پیش نظر فہرست نگار خطوط جامع مسجد بمبئی نے ترقیمے کے سنہ ۱۲۸۰ ہجری
بنادیا ہے۔

۱۔ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، چھٹی اشاعت، صفحہ ۱۲۹

۲۔ فہرست نگار خطوط جامع مسجد بمبئی نے تیس کی بجائے ”بست“ لکھا ہے۔

۳۔ ستائیس

کتب خانہ جامع مسجد بمبئی ہی میں اس معراج نامے کے ایک اور نسخے کے چند ابتدائی
اور اوراق معراج نامہ بلاقی کے ساتھ محفوظ ہیں۔

قاموس الکتاب سے پتا چلتا ہے کہ معظم کے معراج نامے کا ایک نسخہ جو (۱۶) صفحات
پر مشتمل ہے، مولوی عبدالحق کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

شاہ معظم کی یہ مثنوی سولہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدائی پانچ ابواب، حمد، نعت،
مدح صحابہ، منقبت حضرت علی اور منقبت اہل بیت پر مشتمل ہیں۔ چھٹے باب سے معراج
کے واقعات کا ذکر شروع ہوتا ہے، جو پندرہویں باب پر ختم ہوتا ہے۔ سولہویں باب میں
دعا اور مثنوی کی تصنیف کی تاریخ ہے۔ بعض طویل مثنویوں (گلشن عشق وغیرہ) کی اتباع
میں ہر باب کی سرخی ہم زمین شعریں لکھی ہے۔ عنوان کے ان اشعار کو یک جا کر لیا جائے
تو یہ ایک قصیدہ ہو جاتا ہے، جس میں پوری مثنوی کا خلاصہ آجاتا ہے۔ یہ منظوم سرخیاں
درج ذیل ہیں، جن کے مطالعے سے مثنوی کے مضامین کا پوری طرح اندازہ ہو جائے گا:

اول توحید کہتا ہوں سو اس قدرت کے قادر کا

کہ مالک ہے دو عالم کا اور اذق بحر و بر کا

نبی کا نعت کرتا ہوں ہمارک ذلت کا تعریف

کہ او محبوب رب کا ہو رہے صاحب ہفت کشور کا

کتا ہوں منقبت یاراں جو اصحاباں بڑے ہیں یو

نبی کے دوہیں خلیفیاں عمر صدیق اکبر کا

کتا ہوں مدح یوشہ کا کہ او شاہ ولایت ہے

لقب درگاہ سوں جس کوں علی گرام حیدر کا

۱۔ قاموس الکتاب صفحہ ۵۸، غالباً اسی خطوے کا ذکر فہرست خطوط نے، انجمن ترقی اردو، پاکستان کے
صفحہ ۲۲ پر ہے اور سنہ تصنیف سنہ ۱۲۸۰ ہجری بتایا گیا ہے۔

ایسا خاقان دوراں کا ثنا ہو مصفت کرتا ہوں
 جگر گوشہ علی کا پور جو کوئی پیارا ہے سدا
 یونس معراج کی کہتے مشاطا ہو سنواری سو
 عجب سنگار باندیا ہوں سو اس کے درو زید کا
 ہوا ہے امر اشرف یوں لیجا براق تازی کون
 بولالیا جبریل جاقوں دیکھا دیدار ولی بر کا
 نبی خوش خواب سوتے تھے اپنی روح الامیں اگر
 مبارک کہ شہنشاہ کون اچھو تجھ تخت افسر کا
 شتا براق تازی کا جتا تعریف کرتا ہوں

برق سوں تیر تر دستا ہر یک پر جس کے شہ پر کا
 شہنشاہ شوق سوں اوٹھ کر ہوا ہے سوار تازی پر
 منگیا ہے دیکھنے جا کر دوس دل دار دل جبر کا
 مبارک وقت پر غازی پڑیا ہے تخت نوکھن کا
 ہوا ہے شاد شاد اول (دل) دیکھت دیدار دل بر کا
 یو جا گا لامکان کا ہے نہیں یوراد کہنے کا

نبی کون حق (دیا) خلقت جہاں یو دلی فقر کا
 نبی کو چھوک لگی تھی سو کیا معلوم مالک نے
 اور کا نسا سو آیا ہے برج پور شیر شکر کا
 حضور سوں حواری رف کر کیا جب حق دواع شہ کون
 سب جبریل اگر کہنے ہیں امر و تر کا

اوتر جب آنیا شہ گھر میں خیال خواب کا کرتے
 بلال اٹھ جاگت دیتے ہیں ہوا ہے وقت فجر کا
 اپنی پاس منگتا ہوں امیں بولو محبساں سو
 منظم عرصی کرتا ہے پردیشاں حال استہ کا
 مشکوی کا آغاز حسب ذیل شعر سے ہوتا ہے
 اول توحید کہتا ہوں سو اس قدرت کے قادر کا
 کہ مالک ہے دو عالم کا او مازق بحر پور بر کا
 جس کے بعد ہستم اعظم الرحمن الرحیم لکھ کر حمد شروع کی گئی ہے۔ گویا متذکرہ بالا شعر
 حمد کی سرخی ہے الحمد کا آغاز ان اشعار سے کیا ہے۔

اپنی قون قادر ہے سفار کا : قون ادھار ہے (سب زادھار کا
 رحمان تو عالم ہے صاحب سچا : سو کوئی فیکو کہتے سب جگ رچا
 کیا سات اسماں یک پل منے : ہوا ذوق جس سماعت تجھ دل منے
 سو چروا غبق قون کیا ذوق سوں : دیا رنگ پور روپ تداں شوق سوں
 حمد کے بعد نعت لکھی ہے :

نبی کا نعت کرتا ہوں مبارک ذات کا تعریف

کہ او محبوب رب کا پور ہے صاحب ہفت کشور کا

مبارک نول ناؤں تیرا نبی : بولاتا ہے پیاروں سوں تجھ کوں ربی
 عرش پر تو ہے ناؤں تیرا احمد : لیکن کو اتا تھا کہ میں عبید
 سماں کے اوپر تجھ کوں احمد کہتے : زمین پر تجھے سب محمد کہتے
 سو محمود کہتے ہیں تحت السرا : ترا وصف دستا ورا و الورا
 سیادت کیرا تج دیانہ خطاب : اولوالعزم پور شاہ عالی جناب

دیا رب چھتر تجھ کوں لولاک کا ۛ عطا تجھ کیا تخت اخلاک کا
ترے حق میں قرآن نازل کیا ۛ تجھے رب نہ ہدایاں میں فاضل کیا
حمد اور نعت کے بعد علاحدہ علاحدہ سرخیوں کے تحت خلفا، حضرت علی اور اہل بیت
کی منقبت کی ہے۔ شجرۃ الانقیاء کی طرح اس شہنشاہ میں بھی معظم نے حضرت علی کی منقبت
دوبار کی ہے۔ پہلے حضرت صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی کے ساتھ اور پھر علاحدہ سرخی
کے تحت :

کتا ہوں منقبت یاراں جو اصحاباں بڑے ہیں یو

نبی کے دو ہیں غلیظاً عمر صدیق اکبر کا

نبی کے مقرب بڑے یار تھے ۛ ابابکر صدیق دل داوتھے
اول صدق لیائے اوفوں برقرار ۛ نہاں سوں ہوا دین لئی استوار
نبی کے اچھے یار دو جے عمر ۛ کفر کوں کیے فرق سب سرہ سر
قضا پور حدالت کیے ربحساب ۛ سو فاروق جس کا ہے روشن خطاب
نبی کے تیجے یار عثمان تھے ۛ ستوں دین کے ابن عفان تھے
صحیفے کیے حج قرآن کے ۛ مرتب کیے سورے فرقان کے
نبی کے اچھے یار چوتھے علی ۛ خطاب منور ہے جن کا علی
کتے ہیں (جسے) شاہ دلدل سوار ۛ کتے ہیں جسے صاحب ذوالفقار

کتا ہوں مدح یو شہ کا کہ ادشاہ ولایت ہے

لقب درگاہ سوں جس کوں علی کرار حیدر کا
(لا)

۱۔ عنوان میں دو خلفا کا ذکر ہے لیکن تین میں چاروں خلفا کی مدح کی ہے

ایتنا خاتونِ دوراں کا ثنا پور صفت کرتا ہوں
جگر گوشہ علی کا پور جو کوئی پیارا ہے سرور کا

صحابہ اور اہل بیت کی مدح و منقبت کے بعد اصل شہنشاہ شروع ہوتی ہے۔ اس
باب میں شاہ معظم نے شبِ معراج کی ایسی کیفیت بیان کی ہے کہ سماں بندہ جاتا ہے :

عجب رات تھی شاہ کے کاج کی ۛ سو پیارے حبیب کے تھی معراج کی

سو کھن جھیلی اچھی جگ ادجال ۛ زخمی ہیلت القدر اُس کی مثال

کہاں ہیلت القدر ایسی اچھی ۛ فورانی سو یورات جیسی اچھی

غائی و عاشق سوں مشوق کوں ۛ لگائی نوا نیہ کے شوق سوں

.... کا سو سں پھول لاسرا پر ۛ ویسی جھاگ دنی بڑی بخت ور

سوزیرہ نیلا کر مندر لائی تھی ۛ زحل کا پدک کر گلے بھائی تھی

سو طرا شریا لگا کان پر ۛ ... لانے بدل شاہ کوں سرہ سر

کیتے چاند کی آرسی نازتے ۛ ... کر عطارد سو چو سار تے

... سی ناک میں مشتری ۛ لطافت بھری جیوں ویسی شہ پری

موبن مال جو اس سو گل گھال کر ۛ اوپر کھکشاں کا سو پھول مال کر

شفق کی کتی عمل تیلک نچھل ۛ اوپر قوس کی دامن بے بدل

جواہر جتے سب ستارے ہوئے ۛ سو میزان کے گوش پائے ہوئے

زلف کھول بیجاں پڑے کھ اوپر ۛ مگر چاند پر آمل ہے ابر

جو بجیاں ... پائی کیاں پائلاں ۛ جسے دیکھ حوراں بویاں نکالاں

عرش پر بڑا کاج کج آج ہے ۛ خدا کے حبیب کا سو معراج ہے

آرں پور سماں کو سو رکش کیا ۛ سو آفاق کوں صاف کش کیا

اس کے بعد براق کی تعریف کی ہے کہ یہ ایک نازک چھبیل تازی ہے، جس کی نگام گیان کی ہے، سر اور سم مرجان کے ہیں، یا قوت کا پیش بند، لعل کی دچی ہے، اس کے منہ پر تارے جڑے ہیں، اسے صوف سے آشنا کیا گیا ہے، اس لیے کہ اس پر شاہ کون و مکان سوار ہونے والے ہیں۔

رسول اکرم صلعم جوں ہی براق پر سوار ہوئے وہ مسجد اقصیٰ کی طرف روانہ ہوا اور پبلک جھپکنے میں وہاں پہنچ گیا۔ براق کے ساتھ تمام فرشتوں نے بھی پرواز کی اور اس طرح رسول اکرم بڑی شان اور دبدبے کے ساتھ روانہ ہوئے۔ مسجد اقصیٰ سے رسول اکرم صلعم نے آسمانوں میں پرواز کی۔ پہلے آسمان پر چاند نے، دوسرے آسمان پر عطارد نے، تیسرے آسمان پر زہرہ نے جو تھے آسمان پر آفتاب نے، پانچویں آسمان پر مریخ نے، چھٹے آسمان پر مشتری نے خیر مقدم کیا۔ ساتویں آسمان پر نور کے کئی طبق نثار کیے گئے۔

ترنگ سوار جس وقت غازی ہوا : اسی وقت پرواز تازی ہوا
سور براق ات شوق کے خیال میں : سوا اقصیٰ کی سجد کوں یک خیال میں
ہوا پر چلیا زور پسنکھ مار مار : اوڑے سات سارے ملک لیکٹ
مجل سوسارے ملک فوج کر : چلے دبدبے سوں سوا فلک پر
چپ و راست مل مل ملائک چلے : ہر یک مرتبے سو پلے دریلے
اون تازی ہوا برق سوں تیز تر : چلے جبریل زین کا آل دہر
سعادت سوں پلے سا کے اوپر : ہوا سوار جب شہ بلند بخت ور
اول چاند خدمت کوں حاضر ہوا : اسی تے رو عالم پر ناظر ہوا
گلگن دوسرے پر چڑیا شہ گھنیر : عطارد ہوا خاص شہ کا دبیر
چڑیا شاہ تسرے سماوات پر : سوزہرہ کھڑا آؤ صف باند کر
سہیلے شہنشاہ پہ گانے لگی : کنک جنس باجے بجانے لگی

جو چوتھے فلک پر چڑے جیوں شتاب : کمر باند حاضر ہوا آفتاب
..... بادل کیرا ہات لے : چلیا کئی ستاریاں کوں سنگلات لے
کیا..... جب پانچویں..... ننگار : سومریخ خدمت بدل اپ سنوار
ارادت میں..... اس شاہ کا : سو لوکر ہوا اس نول ماہ کا
چھٹے چرخ پر جب چڑیا شہریار : مشرف ہوا مشتری زرنگار
غاباں میں شہ کے سو کم تر ہوا : بزدگی میں ساریاں پہ برتر ہوا
طبق ساتویں پر چڑیا شہریار : نثارے طبق نور کے کئی ہزار
آسمانوں پر ان گنت ملائک اور حوروں نے رسول اکرم صلعم کا خیر مقدم کیا۔ کوئی قصیدہ خوانی کرتا تھا، کوئی پرچم اڑاتا تھا۔ حوروں کی عجب بہار تھی۔ کوئی گاتی اور کوئی ناچتی تھی اور رسول اکرم صلعم کو رحمانی تھی غرض اس طرح :

دیکھا عیش عشرت سونا سوت کا : کسے میر سرگشت ملکوت کا
..... کیتے چلے آئے جبروت کوں : سنوارے تر ت جاکے لاہوت کوں
یہاں پہنچ کر جبریل نے کہا کہ یہ سدرۃ المنتہی ہے اور یہی میرا مقام ہے۔ ایسے میں سامنے سے ایک شیر نمودار ہوا۔ اس حضرت صلعم نے جبریل سے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے۔ جبریل نے عرض کیا : یا رسول اللہ یہ شیر خدا ہے، جو خدا کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتا۔ وہ آپ کی خدمت میں کچھ مانگنے کے لیے حاضر ہوا ہے۔ آپ اس کو اپنی انگشتی عنایت فرمائیں۔ رسول اکرم صلعم نے اس کی طرف اپنی انگشتی پھینک دی اور شیر نے اس کو اپنے منہ میں رکھ لیا۔

اس مقام سے ردا ہونے کے بعد، کافی فاصلے پر، عرش سے ایک خوان اترتا، جس کے نور سے سارے آسمان روشن ہو گئے۔ اس خوان میں چار کاسے دھرے تھے، جن میں سے ایک میں دودھ، دوسرے میں شہد، تیسرے میں پانی اور چوتھے میں شراب

بھری تھی۔ اُس حضرت نے دودھ کا پیالہ لیا اور نوش فرمایا۔ جبرئیل نے مرجا کہا اور بتایا کہ اگر آپ شہد پیتے تو فراموشی پیدا ہوتی، پانی پیتے تو امت غرق ہوتی اور اگر شراب پیتے تو امت کو بڑا ضرر پہنچتا۔ آپ نے خوب کیا کہ دودھ نوش فرمایا۔ آپ کی امت برقرار رہے گی۔

اس کے بعد رف رف اتر۔ رسول اکرمؐ اس پر سوار ہو گئے لیکن جبرئیل تسلیم بھالا کر وہیں کھڑے رہے۔ اُس حضرت نے پوچھا: یا انی! تم کھڑے کیوں ہو۔ کیا ہم اکیلے ہی روانہ ہوں۔ جبرئیل نے عرض کی: اللہ تعالیٰ آپ کا رفیق ہے۔ یہاں سے ایک قدم آگے بڑھیں، میری کیا مجال، میرے پر حمل جائیں گے۔ اُس حضرت رف رف پر روانہ ہوئے اور عرشِ معلیٰ پر اترے۔ بعد ادب مسجد کے اور فرشتے عرش کو بوسہ دیا عرش سے تخت کی آواز بلند ہوئی۔ ستر ہزار پردے، جو درمیان میں حامل تھے، اٹھ گئے۔ طرفین کا شوق بڑھا تو صرف قاب قوسین کا تفاوت رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرمؐ معلم سے پوچھا کہ میرے لیے کیا نذر لائے ہو۔ رسول اکرمؐ معلم نے عرض کی کہ میں تیرا ایک عاجز بندہ ہوں۔ سوائے عمر کے تیری بارگاہ میں اور کیا پیش کر سکتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ نذر سوائے تمہارے کوئی اور ہماری بارگاہ میں نہیں لایا اور اپنی خوشنودی کا اظہار کیا:

گیا دیکھ رف رف عرش کے اوپر: سوائے نبی عرش کے فرش پر
نبی نے ادب سات مسجد کے: عرش کے فرش کوں سولوسہ دیے
عرش پر گئے جب حبیبِ خدا: تحیات کا حق سوں آیا ندا
اتھے بیچ پردے سوستر ہزار: کرم کر کیا دور سب ایک بار
ہوا شوق غالب سو طرفین کا: تفاوت رہیا قاب قوسین کا
کہا رب نبی سوں میرا یار ہے: توں دل بر مرا ہو دل دابر ہے
اگر میں نہ پیدا ہو کرتا تجھے: تو ہرگز نہ لاتا تینا چہیت منجے

میرے سات ملنے جو آیا ہے توں: سو تحفہ نذر کیا جو لیا یا نہ ہے توں
نبی نے سوسر بھیں دھرے ہو رکھے: بحر عاجزی مجھ سکت کیا رہے
جو لیا توں ترے سامنے ذوالجلال: میں مخلوق عاجز مجھے کیا مجال
کیا رب نبی توں جو لیا یا نذر: نہیں کوئی لیا یا بہ جز تجھ بغیر
دیکھا جب سیتے خوب خصلت تیرا: اوی تے کیا تجھ کوں نائب مرا
کیا سارے افعالی تیرے قبول: اوی تے کیا تجھ کوں میرا رسول
پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب سے خواہش کی کہ جو کچھ اس کے دل میں آرزو ہے کہے۔ رسول کریمؐ صلعم نے کہا: اے مجبور! میری امت پر کرم فرما۔ میری امت بہت عاجز و ناتواں ہے اور تو ستار و غفار ہے، تو قادر اور حکمت والا ہے، میں نے اپنی امت سے عہد کیا ہے کہ اس کی شفاعت کروں گا۔

تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے حبیب! تجھے میں اپنے راز و نیاز سے واقف کراؤں جب کچھ نہ تھا اور میں اکیلا تھا تو تیرے دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ تجھے میں نے اپنے نور سے اور اس ساری کائنات کو تیرے نور سے پیدا کیا۔ اسی وقت سے میں تیرا شیدائی ہوں، گنج مخفی کی کنجی تیرے حوالے کی، تجھ پر ہر راز منکشف کیا اور اسم اعظم کا شغل عنایت کیا:

اتہیں جواہل جدہاں کچھ نہ تھا: تدھاں ہو کیلا چہ میں ایک تھا
تجھے دیکھنے ج کون آیا ہو سس: ... کر تجھے میں جو دیکھا اپس
تدھاں سوچ ہے بیار تجھ پر ادیک: رتبا ہوں ترے شاہ رگ سوں نزدیک
مرے نور سوں ج کون پیدا کیا: ترے نور سوں سب ہوید اکیا
تدھاں سو ترے من میں بتا ہوں میں: تدھاں سوں ترے دل میں اچھتا ہوں میں
توں مغرب کوں جایا توں مشرق کرا: ترے سوں کے ہے سامنے سوں میرا

دیا پانچ گنج کا کیلی میں تجھے ۛ لگیا توں بہت آج پیارا مجھے
جو کچھ کشف تجھ پر ہدایت کیا ۛ شغل میں تجھے اسم اعظم دیا
ایسے میں رسول اکرم صلعم کو ایک محل نظر آیا اور آپ نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یہ کیا ہے
اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہاں میرا گنج مخفی ہے۔ تیری انگشت مبارک سے اس کا قفل کھل
جائے گا۔

توں جا دیکھ اس میں ہے قدرت مرا ۛ یو قدرت مرا ہے سو قدرت ترا
معظم کہتے ہیں کہ یہ لامکاں ہے اور اس کا راز کہنے میں نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں
نبی کریم صلعم کو خلعت فقر عطا کیا۔
رسول اکرم جب اس محل میں داخل ہوئے تو وہاں سوائے نور کے کچھ نہ تھا اور
سوائے ایک کلمہ کے وہاں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ رسول کریم نے اللہ تعالیٰ سے کہا: یہ
کیا بھید ہے، کھول کر ارشاد فرما۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

دیا رب وجود نہیں جو دستا ہے یو ۛ ترا نور مجھ میں ہوا ہے محو
ترا نور اکرم لبیا نور میں ۛ ندی جیوں لے جا کے سمور میں
کلم مجید سو خرقہ میرا ۛ بڑے پیار کا ہے یو برقعہ مرا
جو تشریف تجھے دیوں گا خوب ہے ۛ بحر توں مجھے کون محبوب ہے
ولیکن کتا ہوں تجھے یا رسول ۛ ادب بھوت رکھ ہو رفاقت قبول

رحمیاں رحم ہو کر کم نبی کیا ۛ یو خرقہ فقر کا نبی کوں دیا
شاہ معظم کہتے ہیں کہ اس کے بعد رسول اکرم کو اشتہا محسوس ہوئی۔ غیب سے
شیر برنج کا ایک کاسہ اترا۔ رسول اکرم کو اکیلے شیر برنج کھانے میں تکلف محسوس
ہوا اور انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنے اس تردہ کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: اچھا

تم ہمارا نام لے کر شروع کرو، کوئی شریک ہو جائے گا۔ رسول اکرم نے شیر برنج سیر ہو کر
کھایا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بڑے پیار سے ایک خربوزہ عنایت فرمایا، جو مہری سے
زیادہ میٹھا تھا۔ رسول اکرم نے خربوزہ تو کھالیا لیکن رنج امت کے لیے چھپا رکھے۔
اللہ تعالیٰ نے بڑے لطف سے پوچھا کہ اے میرے حبیب تم نے چوری کیوں کی۔
رسول اکرم نے جواب دیا تو مومن اور ہمیں ہے، میں تجھ سے کیا عرض کر سکتا ہوں۔ یہ
رنج میں نے امت کے لیے بچا لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو بڑی خوشی ہوئی کہ اس کے حبیب
کو اپنی امت کا اتنا خیال ہے۔

معظم کہتے ہیں کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے تمھارے دیکھنے کا شوق
ہوا تھا، اس لیے تم کو بلایا۔ تمھارے دیکھنے سے دل کو تسکین ہوئی، اب تم سدا ہارو۔
اس موقع پر شاہ رسول اکرم کو مبارک باد دیتا ہے:

مبارک جسم کی دیو، معراج ہے ۛ مبارک تراخت ہو راج ہے
اچھو ہفت کشور میں شاہی تری ۛ سو تخت السرا لگ دورا ہی تری
مبارک تجھے تاج لولاک کا ۛ مبارک تجھے تاج افلاک کا

رسول اکرم رف رف پر سوار ہو کر عرش سے روانہ ہوئے بہت دور جانے
کے بعد جبریل سے ملاقات ہوئی۔ جبریل نے رسول اکرم سے کہا کہ دو گانہ شکر ادا
کیجیے اور امت پر اس کو واجب کیجیے۔ اس کے بعد جنت کی سیر کرائی۔ یہاں جتنے
طاہک، اولوالعزم اور مرسل تھے، ان سے اس حضرت کی ملاقات ہوئی۔

معراج کے واقعے کو ختم کرتے ہوئے معظم نے دو مشہور روایتوں کو نظم کیا ہے۔
ایک تو یہ کہ اس سیر کے بعد جب رسول اکرم کھڑے ہوئے تو بستر گرم تھا۔ دوسری روایت
یہ ہے کہ ایک یہودی کو اس حضرت کی یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوئی کہ بستر کی گرمی کم ہونے
جی نہیں پاتی تھی کہ وہ آسمانوں کی سیر کر کے لوٹ آئے، لیکن خود وہ ایک ایسے تجربے

رجب کی ستاویں یونامہ تمام ۱۰
 نبی پر ہزاروں درود و سلام ۱۱
 یونامہ جہاں میں ہوا جب ختم ۱۲
 اگیارہ صدی میں ہاتھ تیس کم ۱۳
 یونامہ کیا کہ مجھے حق دیا ۱۴
 مجھ عاجز کو سلطان معظم کیا ۱۵
 توں ستار، غفار اے کار ساز ۱۶
 گنہ بخش میرا اے بندہ نواز ۱۷
 پڑھے یا سننے کوئی اے کان دھر ۱۸
 نبی کے بدل توں او سے پیار کر ۱۹
 مرا عرض ہے تجھ سوں اے کردگار ۲۰
 رجب کو معصوم کر ۲۱
 ایسا جگ میں نامہ یو مشہور کر ۲۲

شاہ معظم نے اپنی اس مثنوی میں ان تمام ضعیف اور من گھڑت روایات کو بغیر کسی تحقیق کے پوری عقیدت اور کامل یقین کے ساتھ نظم کر دیا ہے، جو معراج کے تعلق سے عام ہیں۔ یوں بھی وہ تاریخ، بزرگوں کے سوانح اور کرامات کے تعلق سے ہر سنی سنائی بات کو، خواہ وہ روایت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، پورے وثوق کے ساتھ بیان کرنے کے عادی ہیں۔ چنانچہ شجرۃ الاتیقیا اور گلزارِ بہشت میں اس قسم کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

زیر نظر مثنوی کے اس حصے پر جہاں شبِ معراج کا ذکر ہے، شاہِ معظم نے بڑا زور قلم صرف کیا ہے۔ ادبی حیثیت سے بھی حصہ مثنوی کی جان ہے۔ دو ایک جگہ اور بھی ادبی جھلکیاں ملتی ہیں، مثلاً براق کے سراپا کا بیانِ ندرت، فکر اور شاعرانہ تخیل کا بہترین نمونہ ہے۔ ان مقامات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہِ معظم چاہتے تو پوری مثنوی میں شاعرانہ لطافت پیدا کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے فکر و فن پر نہیں بلکہ روایتوں کی

Mohammad Hanif Razvi Nagarchi
Near Jamia Masjid, Arcot Dargah,
BIJAPUR-586104, (Karnataka)

ساقی نامہ

شاہ معظم کی اس مثنوی کا صرف ایک ہی نسخہ دست یاب ہوتا ہے، جو کتب خانہ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی (نمبر خطوط ۷۲ تصوف) میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ (۱۵) صفحات اور (۱۹۱) ابیات پر مشتمل ہے۔ سرنامہ اور ترقیمہ نہیں ہے ساقی نامہ شاہ معظم کا ادبی کارنامہ ہے، لیکن کتابت کی غلطیوں کی وجہ سے اس کے اکثر الفاظ مسح اور متعدد مصرعے بحر سے ساقط ہو گئے ہیں۔ جب تک اس مثنوی کا کوئی دوسرا نسخہ برآمد نہ ہو صحیح متن کا مرتب کرنا بہت مشکل ہے۔

مثنوی کی لوح پر دو نام جدید قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ ساقی نامہ یا راگ مالا۔ اگرچہ ساقی نامے میں ساقی اور مطرب سے خطاب اور مئے و سرود کی تعریف ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود کسی مثنوی کا نام ساقی نامہ یا راگ مالا ان مل اور بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے اور شاہ معظم جیسے باکمال اور صاحب ذوق شاعر سے اس بد ذوقی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہ ستم ظریفی انجمن کے فہرست نگار کے قلم کی ہے۔

زیر نظر مثنوی کے نصف اول میں ساقی نامے کے مضامین باندھے گئے ہیں اور نصف آخر میں نغمہ و سرود کی عظمت اور اس کے اثرات کا شاعرانہ انداز میں ذکر ہے۔ نصف اول کی طرح نصف آخر کے مضامین بھی ساقی نامے ہی کے ہیں۔ اس لیے

نغمہ و سرود کے ذکر کے باوجود اس مثنوی کو ساقی نامہ ہی کہنا چاہیے۔

راگ مالا اصطلاح میں اس نظم کو کہتے ہیں، جس میں سنگیت کی اصل، اسما کی پیدائش، راگوں، راگنیوں، پتر اور بھار جاؤں کی تفصیل، ان کے حوصلوں، رنگ، پوشاک، تاثیر اور ان کے موسم اور وقت کا بیان ہوتا ہے۔ سنسکرت، ہندی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں اس قسم کی بیسیوں نظمیں ملتی ہیں، لیکن اردو میں صرف ایک ہی راگ مالا کا پتا چلا ہے، جو بارہویں صدی کے رند مشرب، صوفی منش، اور سیلابی الطبع شاعر عبدالولی عزلت (۱۱۰۴ - ۱۱۹۸ ہجری) کی تصنیف اور ان کے کمال موسیقی کی سند ہے۔ یہ مثنوی (۱۱۹۵) ابیات پر مشتمل ہے، جس میں چھ راگوں، ان کی پانچ راگنیوں اور آٹھ پتروں کی تفصیل اور ان کی لفظی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ معظم کی مثنوی جس راگ مالا کے یہ مضامین اور موضوعات نہیں ملتے۔ اس لیے وہ اصطلاحی مفہوم میں راگ مالا نہیں ہے۔ البتہ راگ مالا کے اصطلاحی مفہوم میں اتنی وسعت اور لچک پیدا کی جائے کہ ساز و سرود کی عمومی توصیف اور ان کے کیف و سرود کے بیان کے لیے بھی اس میں جگہ نکل آئے تو پھر شاہ معظم کی یہ مثنوی ساقی نامہ بھی ہے اور راگ مالا بھی، لیکن جب ساقی نامے کے موضوعات میں مئے و ساقی کے ساتھ مطرب و نغمہ کے لیے بھی گنجائش موجود ہے تو راگ مالا کے دامن کو اتنا وسیع کرنا کیا ضروری ہے کہ اس کے تار و پود ہی بکھر جائیں۔ شاہ معظم کی یہ مثنوی کئی اعتبارات سے بڑی اہم ہے۔

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راگ راگین از اور سی۔ گنگولی۔

۲۔ ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ (مثنویات، ۹۱) اور دوسرا انڈیا آفس (۱۰۱) میں ہے۔

مشفق خواجہ کے بیان کے مطابق انجمن ترقی اردو، پاکستان کے کتب خانے میں کسی مخطوطے کی ایک نقل محفوظ ہے، جو زمانہ حال کا لکھا ہوا ہے (بہ حوالہ راگ مالا مرتبہ عبدالرزاق قریشی صفحہ ۱۶) قریشی صاحب نے انھیں مخطوطات کی بنیاد پر راگ مالا مرتب کر کے شائع کی ہے۔

پہلی اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ اردو کا پہلا ساقی نامہ ہے۔ ساقی نامہ فارسی کی دین ہے، جو عموماً بحر متقارب مثنوی مقصور (محدوف) اور مثنوی کی ہیئت میں لکھا جاتا ہے۔ سنے و مینا، ساقی و شاہد، نغمہ و مطرب اور کیف و مستی کے مضامین ساقی کے بنیادی موضوعات ہیں، لیکن کبھی کبھی ان مضامین کے علاوہ دنیا کی بے ثباتی، کمال کی ناقدری اور گردش روزگار کا ذکر بھی کیا جاتا ہے اور تصوف و حکمت کے نکات بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ دکنی ادبیات میں یہ مضامین ابتداء ہی سے ملتے ہیں، لیکن اس مرتبہ اور مربوط شکل میں نہیں ملتے، جس سے ساقی نامہ عبارت ہے۔ شیخ چاند مرحوم نے محمد نعیمہ درومند کے ساقی نامے کے مقدمے میں لکھا ہے :

”درومند کو اردو زبان کی تاریخ میں جو جگہ ملتی ہے وہ محض ان کی مثنوی ساقی نامے کی وجہ سے ہے۔ یہ ایک مثنوی ہے، جس کا تعلق خمریات سے ہے۔ یہ کوئی عشقیہ مثنوی نہیں ہے، اس لیے اس میں کسی فسانے کی مسلسل و مربوط رویداد نہیں۔ اس کے نام (ساقی نامے) سے ظاہر ہے کہ زندگی و مستی اور خمر و نشہ کے مضامین کی حامل ہے۔ اس کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اردو زبان میں ان مضامین کو اس شکل میں مستقل طور سے پہلی دفعہ اس قادر الکلامی کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔“

اس خیال کو زیادہ وضاحت کے ساتھ آگے بڑھ لکھا ہے :

۱۔ شیخ چاند مرحوم نے مولوی عبدالحق کے کتب خانے کے تین نسخوں سے مقابلہ کر کے ساقی نامہ درومند کا متن طویل تحقیقی مقدمے کے ساتھ رسالہ اردو بابت جولائی ۱۹۳۲ء عیسوی میں شائع کیا تھا۔ ساقی نامہ درومند کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں اور ایک کتب خانہ انجمن ترقی اردو، ہند، علی گڑھ، دہلی میں بھی محفوظ ہے۔

۲۔ رسالہ اردو، بابت جولائی ۱۹۳۲ء عیسوی، صفحہ ۵۸۲

فارسی میں ساقی نامے شاعروں نے کثرت سے لکھے ہیں، لیکن اردو میں ان کا وجود نہ تھا۔ درومند سب سے پہلا شاعر ہے، جس نے اس اہتمام اور کامیابی کے ساتھ یہ نظم لکھی کہ اس کے بعد کسی شاعر کو لکھنے کی ہمت نہیں ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ تمام اساتذہ نے اس کی تعریف مستوفی اللسان ہو کر کی ہے۔“

شیخ چاند مرحوم کے اس ادعا کو پچھلے تیس برسوں میں برابر دہرایا جاتا رہا ہے چنانچہ ساقی نامہ عزلت کے مقدمے میں بھی اس کی صدا کے بازگشت سنائی دیتی ہے :

”سلطان محمد قلی قطب شاہ اور قدیم شعرا کے یہاں تعریف شراب سے متعلق جو چند اشعار پائے جاتے ہیں وہ قدیم عربی و فارسی شعرا کی مدح خمر کی طرح محض زیب داستان کے لیے ہیں۔ سب سے پہلے جس شاعر نے اس صنف کی طرف توجہ کی وہ محمد نعیمہ درومند ہیں۔“

لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے۔ سب سے پہلا شاعر جس نے اس صنف کی طرف توجہ دی وہ درومند نہیں معظم ہے۔ درومند کے ساقی نامے کے سبب تصنیف کا علم نہیں، عزلت نے درومند کے جواب میں اپنا ساقی نامہ ۱۹۳۲ء ہجری میں لکھا تھا۔

بیان ظہور اس کا تاریخی نام ہے۔ درومند اور عزلت ہم عصر تھے۔ اس لیے قیاس کہتا ہے کہ درومند کا ساقی نامہ ۱۹۳۲ء ہجری سے کچھ ہی پہلے لکھا گیا ہو گا۔ شاہ معظم کے ساقی نامے کے سبب تصنیف کا پتہ چل سکا، لیکن اس کو اگر ان کی آخری عمر کی تخلیق بھی مانا جائے

۱۔ رسالہ اردو، بابت جولائی ۱۹۳۲ء عیسوی، صفحہ ۵۸۳

۲۔ عبدالرزاق قریشی نے ساقی نامہ عزلت کے ایک ناقص متن کو نواسہ ادب جولائی ۱۹۶۲ء عیسوی میں شائع کیا ہے۔

۳۔ ساقی نامہ عزلت، نواسے ادب، بابت جولائی ۱۹۶۲ء عیسوی، صفحہ ۶

تو اس کا زمانہ تصنیف بارہویں صدی کی تیسری دہائی ہو گا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ معظم کا ساقی نامہ دردمند کے ساقی نامے سے کم از کم پچاس سال پہلے لکھا جا چکا تھا۔

اگرچہ کوئی داخلی یا خارجی شہادت ایسی دست یاب نہیں ہوتی، جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ دردمند کی نظر سے شاہ معظم کا ساقی نامہ گزر چکا تھا، لیکن راقم الخوف کا قیاس ہے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ساقی نامہ معظم سے واقف ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ خود دکن کے باشندے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ ان کے پیر اور استاد مرزا مظہر جان جاناں کے والد مرزا جان سلسلہ ہجری سے قبل عالم گیری فوج کے ساتھ بیجاپور میں رہ چکے تھے اور یہیں شادی بھی کر لی تھی۔ یہ تو نہیں معلوم کہ مظہر جان جاناں کی بیجاپور کو آمد و رفت رہی یا نہیں لیکن قرینہ اس کا ہے کہ تفصیل سے تعلق برقرار رہا ہو گا۔ جمعی تو ان کا کلام ان کی زندگی ہی میں بیجاپور پہنچا اور مقبول ہوا۔ یہی نہیں بلکہ بیجاپوری شعرا نے ان کی غزلوں پر غزلیں کہیں۔ چنانچہ قطع نظر دوسرے شعرا کے حضرت امین کے سلسلے کے چوتھے سجادے بابا شاہ حسینی عرف پیر یا شاہ کی بعض غزلیں ایسی ملتی ہیں جو جان جاناں کی غزلوں پر کہی گئی ہیں۔ ان واقعات کی بنا پر یہ قیاس دور از کار نہیں کہ مظہر جان جاناں بیجاپوری شعرا کے کلام سے واقف ہوں گے اور معظم کا ساقی نامہ ان کی

لے اور گریض بیدر (سابق حیدر آباد، حال کرناٹک) کے نجبا سے تھے۔ کم سنی میں اپنے والد کے ساتھ ۳۳۶ ہجری میں شاہ جہاں آباد دہلی چلے گئے۔ ابتدا میں شاہ ولی اللہ اشتیاق مرہندی کے زیر تربیت رہے، پھر والد کے انتقال کے بعد جان جاناں کے سایہ عاطفت میں آ گئے۔ فارسی کے شاعر تھے۔ ریختہ کی نسبت لکھا ہے کہ جان جاناں کی محبت سے مجبور ہو کر اس میں طبع آزمائی کی۔ دلی میں ان کا قیام تیس سال رہا۔ مرشد آباد میں انتقال ہوا۔

۱۶۸

کتاب حیات (مکتبہ اشاعت اردو) صفحہ ۱۶۸

نظر سے گزرا ہو گا، اور ان کے توسط سے ان کے محبوب شاگرد ادمرید کو اس ساقی نامے کی سن گئی ملی ہوگی بلکہ کیا عجب ہے کہ جان جاناں نے دردمند کو معظم کے ساقی نامے کے ڈھنگ پر ایک ساقی نامہ لکھنے کا مشورہ بھی دیا ہو۔ اس قیاس کو تقویت خود دردمند کے ان اشعار سے ہوتی ہے:

خدیو سخن میرزا جان جاناں ۛ کہ حکم اس کا ہے ناطقے پر رواں
اوسے سب میں یارب امانت ہے ۛ قیامت تلک وہ سلامت ہے
کہاں تھا مجھے ریختہ کا خیال ۛ ہوا واجب اس امر کا امتثال
محبت نے مجھ کو کیا لا جواب ۛ وگرنہ میں اور ریختہ کیا حساب
دردمند، معظم کے ساقی نامے سے بے خبر بھی رہے ہوں تو بھی تقدیر زانی معظم ہی کو حاصل ہے۔

ساقی نامے کے بنیادی موضوع سے و نغمہ کو معظم نے دو حصوں میں بانٹ دیا ہے پہلے حصے میں سے و مینا اور کیف و مستی کے مضامین باندھے ہیں اور دوسرے حصے میں ساز و نغمہ اور اس کے سرور و نشاط کو بیان کیا ہے۔ معظم نے ساقی نامے کے ان دو موضوعات پر بہ ظاہر دو علاحدہ حصوں میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن درحقیقت اس ساقی نامے کا بنیادی موضوع کیف و مستی ہے، جو ایک حصے میں شراب سے حاصل کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں نغمے سے۔ تاہم ساقی نامے میں سے و نغمے کے موضوع کا یہ تجربہ معظم کی جدت طبع کا نتیجہ ہے۔ معظم کے بعد مستقل صنف ادب کی حیثیت سے کم ہی ساقی نامے لکھے گئے ہیں، لیکن ان میں بھی کہیں یہ جدت اور اوج نظر نہیں آتی۔ دردمند نے اپنے ساقی نامے کے آخری حصے میں مطرب کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن انتہائی سرسری انداز میں اور دو چار اشعار پر ہی اکتفا کیا ہے۔

ساقی نامہ معظم کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس مثنوی کو حقیقت اور محاز

کے تار حیر دورنگ سے اس خوب صورتی اور چابک دستی کے ساتھ گوندھا گیا ہے کہ کوئی رنگ دوسرے پر غالب نہیں آتا۔
جو تخی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مثنوی شاہ معظم کی صوفیانہ شاعری کے سرمایے میں سب سے زیادہ ادبی نکھار رکھتی ہے۔

معظم مثنوی کا آغاز خدا کی ساقی گری کے ذکر سے کرتے ہیں:

الہی توں ساقی ازل سوں مدام : پلاتا ہے توں جام سب کو تمام
پلاتا ہے اول بھی آخر سوں توں : شرابا طہورانی محشر سوں توں
سقا ہوں کھیا ہے او آپیں دہنی : ہے ساقی ہمارا او آپیں غنی
خدا کی ساقی گری کے ذکر کے بعد وہ شعروں میں ساقی کی حیثیت سے رسول اکرمؐ کا ذکر کیا ہے :

اتاقوں پلانے کوں نائب کیا : کہتے ہیں جسے خاتم الانبیاء
حیات النبی ہات لے جام کوں : پلاتا ہے سب خاص جو عام کوں
خدا اور رسول کے ذکر کے بعد وہ کائنات کی ہر شے کو اسی شراب کے نشے سے سرشار دکھاتے ہیں اور اپنے پُر جوش اسلوب میں ایک ایک چیز کی مستی اور سرشاری کا ذکر کرتے جاتے ہیں :

اسے پی سوں ہیں مست سب انبیا : اسے پی سوں ہیں مست سب اولیا
اسے پی سوں یو مست عشاق ہیں : اسے پی کے عاشق یو مشتاق ہیں
اسے پی سوں یو مست مجذوب ہیں : اسے پی سوں یو مست محبوب ہیں
اسے پی سوں مدوش شہدا ہوئے : اسے پی سوں مر مست شیدا ہوئے
اسے پی سوں مقبول راصل ہوئے : اسے پی سوں کامل یو فاضل ہوئے

اسے پی سوں چو مست شمس و قمر : دیکھو مست پھرتے ہیں کیوں بے خبر
زمانہ ہو امت ہر ملک بھر : دیکھو چرخ پھرتا ہے گردش قمر
دیکھو مست سارے ستارے پھرتے : فلک پر کے سارے پوتارے ہوئے
دیکھو مست ہر قطب ہلتا نہیں : ہوا کیف سو کیں او چلتا نہیں
مظاہر کائنات کی مستی کا یہ ذکر طولانی ہے، لیکن جس طرح اوپر کے اشعار کے صدر میں ایک جیسے فقرات کی تکرار سے زور بیان پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے بقیہ اشعار میں یہ اہتمام ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ ہر حال ساری کائنات کو مست و بے خود بنانے کے بعد وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوتے ہیں کہ اے معظم اٹھ اور ساقی سے جام خاص کے لیے اتنا س کر، اور ساقی کے استعارے کو کھولتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارا ساقی خدا کا رسول ہے اور رسول کے نائب علی ہیں اور علی ہی ساقی کوثر ہیں۔ اسی ساقی کوثر سے دین اور دنیا کی کامرانی وابستہ ہے :

ہمارا ہے ساقی خدا کا رسول : مناجات میرا کرے گا قبول
نبی کا سونائب علی ہیں کہتے : او برحق خدا کا ولی ہیں کہتے
نبی کا کہتے یار یاد ہے او : پیلائے کوں ساقی کوثر ہے او
اُسی سوچ یو عرض کرتا ہوں میں : اُسی سوچ بی کام دھرتا ہوں میں
اُسی سوچ محشر میں مجھ کا کام ہے : اُسی سوچ دنیا میں آرام ہے
اس سلسلے کے اشعار کو آگے اتنا الجھا دیا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عرض رسول کریمؐ سے ہے یا حضرت علیؑ سے یا اللہ تعالیٰ سے۔ چنانچہ کہتے ہیں :
ازل کا توں استاد میرا حکیم : ہے مشہور تیرا کرم یا کریم
تخاطب جس کسی سے ہوا تجا شراب معرفت کی ہے، لیکن اس کے بعد بد کیفی اور شراب کی آواز کا ذکر جس انداز میں کیا ہے اس سے توں اندازہ ہوتا ہے کہ شراب

حقیقی نہیں مجازی ہے :

مرے سر میں ہے دردِ خمار کا : ہے دوسرا دردِ دل کوں بیمار کا
ایسی درد کا تن میں جگ تاب ہے : اسی درد سوں جیو بے تاب ہے
منجم اور خال ہمارے تمام : مداو کیے آکے سارے تمام
درد دیکھ ہمارے ہیں سائے حکیم : جیسے شہر میانے ہیں سائے ندیم
نجانوں مرا جیو ہے تن میں کہاں : نجانوں چھو پاسے بدن میں کہاں
تداوے کدھیں جو کدوں ہوش میں : نپٹ ہو گئے پڑتا ہوں بے ہوش میں
شراب کوئی سی ہوا التجا بہ ہر صورت ساقی حقیقی ہی سے ہے :

ہر ایک باب کا علم رکھتا ہے توں : ہر ایک باب حکمت ہی دھرتا ہے توں
کتے خوب حکمت ہے حج جان میں : ایسا دور کرتا ہے یک ساعت میں
ایسا جام دیتا ہے کوئی پیار سوں : ایسا دور کرتا ہے آزار سوں
ایسا دور ہوتا ہے کلفت مرا : ایسا دور ہوتا ہے زحمت مرا
ایسا عرض ہے حج سوں اے کلاساز : ایسا جام دو چار کر سرفراز
ساقی حقیقی سے اس مخاطب کے بعد پھر وہ شراب کی التجا اس طرح کرتے ہیں جیسے
یہ مجازی شراب ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ مات کے گزر جانے کے اندیشے کا اظہار
بھی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ طلوع آفتاب سے پہلے جس قدر پی سکتے ہوں پی لیں
ساقی نامے کے وہ شعر بہت دل چسپ ہیں جن میں شاہ معظم رات کے
آخری پیر، سپیدی سحر، باغ و بہار کی کیفیت وغیرہ کا ذکر ایک بادہ خور کی طرح
لچا لچا کر کرتے ہیں :

اے ساقی یو پہرا ہوا نور کا : طلب کر سہے ناب انگور کا

اے ساقی منگا جام جمشید کا : اجالا ہوا دیکھ خورشید کا
توں اوٹھ بیگ ساقی کرم کر عمیم : چلیا ہے یو بادِ مباح خوش نسیم
کرم کر اے ساقی عجب وقت ہے : مجھے دردِ خمار کا سخت ہے
پینا مئے زمستان کے منگام میں : یو پھر جوان ہوتا ہے یک جام میں
اس سلسلے میں شاہ معظم نے بڑی شاعرانہ معنی آفرینی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اے
ساقی تو اپنے آفتاب جیسے چہرے سے نقاب الٹ دے، دردِ آفتاب نکل آئے گا۔
اور شراب کا سارا لطف جاتا رہے گا۔

اے ساقی تو کھ پر سے سٹھ نفا : مبادا نکل آئے گا آفتاب
پیلایک ہر قدح مجھ نور کا : ہے مشرق طرف دیدیا سور کا
یو خود گرو رکھ کے یک جام دے : پیلا پے پیلایک کون آرام دے
اے ساقی تو واقف مرے حال کا : منگا جام کہنہ اودہ سال کا
دے تب مجھے گنج لاریب کا : دھینہ نکل آئے سب غیب کا
اے ساقی یو فرصت سمجھ کر چکا : منگا ادھراچی ہرے پاچ کا
پیے سوں کتے دور ہوتا ہے رنج : زمیں سے کتے اس کون دکتا ہے گنج
اے ساقی مئے ناب صاف و صفا : شکستہ دلاں کوں کیسے ہے نفا
منگیا بیگ ساقی رنگیلا شراب : پیاسے کوں پانی پیلانا صواب
ظاہر ہے کہ ان اشعار میں رات کی نفا، طلوع آفتاب کا اندیشہ، سہے انگور
کی آرزو، نش کی مختلف کیفیات کا بیان مجازی سے مستی سے تعلق رکھتا ہے، لیکن
عجیب بات ہے کہ اس کے بعد ہی وہ اپنے شیخ قادر لنگا سے مخاطب ہو جاتے ہیں:
اے قادر تو ساقی سزاوار ہے : پیلانے کوں توں دور... ہے
ترا عکس دیکھا جو کوئی جام میں : رہتا ہے مٹا ہو کر آرام میں

ان اشعار کے بعد کسی تہید کے بغیر کسی مخصوص پر فضا مقام کی کیفیت کا بیان ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جگہ کچھ شعر چھوٹ گئے ہیں،

یو جاگا اسی سے فرح بخش ہے ۞ کتے ہفت کشور اپر نقش ہے
یو شرف المکاں بیچ بیت الحرم ۞ تصدق کیا اس پر باغ ارم
عجائب درختاں کوں دیکھ سایہ دار ۞ کتے عاشقاں اس کوں دار القرار
حریفان اُسے باغ بستان کتے ۞ پھلوں کو یہاں کے گلستان کتے
عجب باغ روشن منور ہے یو ۞ عجب حوض میاںے تو کوثر ہے یو
دنیا میں تو یو باغ فردوس ہے ۞ کتے تیں جو دیکھا تو افسوس ہے
ہمیشہ یہاں یار کا ہے گزر ۞ ہوا باغ یو مست سب سیر کر
دیکھو مست ہو سر و ڈھلتے ہیں کیوں ۞ دیکھو مست شمشاد ڈھلتے ہیں کیوں
دیکھو مست دستے تیں سر کی چول ۞ ہوئے مست سائے یو گلشن کے چول
زلف دیکھ کر مست سنبھل ہوا ۞ اسے دیکھ کر مست بلبل ہوا
اسی یار کا دیکھ کہنے کوں راز ۞ یو سوسن زباں کوں کیا ہے دراز
تیں دیکھ کر مست زرگس ہوا ۞ اسے دیکھ کر مست مجلس ہوا
ہو کنول دیکھ تالاب میں ۞ عجب مست دستے میں سیراب میں
مٹھی باس بی ہے یو مد مالتی ۞ یو مستی یو مستی کوں سب گھالتی
یو خوش باس سول سب مٹھ ہے باغ ۞ اسی باغ سول خوش ہوا ہے دماغ
مدن بان کا باس تو خاص ہے ۞ ولے موگرا اس سول خوش باس ہے
یو چنپا لیا ہے عجب تلخ باس ۞ بھنور گرتے ہیں اُن دیتا ہے باس
چمیلی میں ہے باس عروس کی ۞ کتے باس اتنی ہے فردوس کی
چھولی ہے دیکھو کیت کی سر بسر ۞ تو قربان ہوتا ہے اس پر بھنور

عجائب دیکھو سیوتی کا بہار ۞ عجائب چھولی رلیوتی بے شمار
چمن میں عجائب نشیمن ہے یو ۞ عجب ٹھار دل کش سودا من ہے یو
حجر پور شجر مست سرشار ہیں ۞ ہمیشہ سدا مست دیدار ہیں

چمن میں چھو لیا ہے یوں سارا گلاب ۞ طلب کر قوالاں کوں بیگی شباب
دیکھو یار کوں کیوں رجھانے بدل ۞ خرد ساں یو مل ناں گاتے نخل
دیکھو طاراں مست ہو بولتے ۞ چھپے راز سب اس کے مرغولتے
کتک جانور بولتے خوش آواز ۞ اسی یار کا راز کرتے ہیں واز
چمن درجن دیکھ لا لا ہے مست ۞ یو سو سیوی دیکھ بالا ہے مست
نقل کوں یہاں گنج در گنج ہے ۞ یو منے خوش عجب دیکھ نالغ ہے
عجائب ہے شیریں یہاں نیشکر ۞ مقابل کوں اس کے نہیں کچھ دگر
ولایت کے میوے تو اقسام میں ۞ ولے یہاں گلابی عجب جام میں
یہاں انتہ تو عام ہو خاص ہے ۞ پھنس سوں سرس یہاں اناس ہے
کتے جس کوں خار کا کچھ ہے رنج ۞ او سے دور کرتا بھی کہتے ترنج
دیکھو یہاں عجائب ہے آثار یو ۞ کتے دور کرتا ہے خار یو
باغ بہار کا یہ سماں معظم کے دل کو گرگاتا ہے اور وہ ساقی سے شراب نغمہ
کی فرمائش کرتے ہیں:

نقل ہے مہیا شراب و کباب ۞ منگا بیگ ساقی شراب رباب
مرے پر اتنا کیف غالب ہوا ۞ مرا راگ پر جیو طالب ہوا
منے وساقی کی سرمستیوں اور باغ و بہار کی رنگینیوں کا بیان ہو چکا، اب مطرب
و نغمہ کی پوش ربانی اور دل ستانی کا ذکر چھڑتا ہے:

معنی تو ہے آشنا یار کا ۛ اور مطرب تو محرم ہے اسرار کا
 معنی زبانوں کوں درازی کرے ۛ اور مطرب کہ میں جنگ بازی کرے
 ایسا مست ہوتے ہیں سب خاص دعا ۛ ایسا مست ہوتا ہے مجلس تمام
 اگر قول گاتے ہیں کچھ یو قوال ۛ ایسا مست صوفی یو کرتے ہیں حال
 معنی کے گانے پہ زہرہ بھی دنگ ۛ اور مطرب بجاتا ہے جو موسوں جنگ
 معنی تو کرتا زبان کا ہنسہ ۛ اور مطرب عجائب بجاتا جعفر
 کرامت معنی کی ہے بات میں ۛ سحر ہے یو مطرب کے کچھ بات میں
 اور مطرب اگر بات لیتا ہے دف ۛ ایسا غم کوں کرتا ہے سب بر طرف
 نغمہ و سرور کی فضیلت اور اہمیت اور اس کے سحر و اعجاز کی طرف اشارہ کرتے
 ہوئے شاہ معظم بعض مسلمان موسیقاروں کے اس خیال کو دہراتے ہیں کہ راگ
 در حقیقت عشق کی آگ ہے۔ جسم میں پہلے راگ آیا اور اس کی تلاش میں روح
 جسدِ فانی میں داخل ہوئی۔ چنانچہ سید عبدالولی عزلت راگ مالا میں عظمتِ سرود
 کے عنوان کے تحت کہتے ہیں،

خدا نے جب تن آدم بنا کر ۛ کہا اے روح تو جا اُس کے سمیتر
 کیا عرض آہ بھر کر روح نے یوں ۛ اندھیری کوٹھری میں جا بسوں کیوں
 کہا تب ایک ملک کو بیٹھ تن میں ۛ تو بول ایک راگ آدم کے بدن میں
 ملک سے سن کے تائیں درد کی کئی ۛ دوانی ہو کے تن میں روح آگئی
 سروری سے ہول ہے جیتا انسان ۛ جو سچ بولوں تو تھا نغمہ وہی جاں
 شاہ معظم کے ذہن میں بھی مسلمان موسیقاروں کی بھی تاویل تھی، لیکن وہ عزلت کی طرح

لے ملاحظہ ہو، غنیہ راگ

لے راگ مالا (۹۱) مثنویات، کتب خانہ آصفیہ۔

تفصیل میں نہیں گئے ہیں بلکہ موسیقی کی اثر انگیزی اور اثر آفرینی کا بیان کرتے ہوئے اس
 طرف بھی اشارہ کر گئے ہیں :

بڑا علم قدرت میں یو راگ ہے ۛ کتے راگ سو عشق کا آگ ہے
 بھلاتا ہے محبوب کے غیر کوں ۛ جلاتا ہے سب کفر و ہور ویر کوں
 اول تن میں یو راگ آیا کتے ۛ مٹھے نرسنا کر بلایا کتے
 اویں دن سوں ہے راگ میرا رفیق ۛ اویں دن سوں ہے راگ میرا شفیق
 اسی راگ سوں راز ظاہر ہوا ۛ چھپا راز پر دے سوں باہر ہوا
 راگ کو اصل حیات اور محرم اسرار ٹھہرانے کے بعد کہتے ہیں کہ یہ وہ طاقت ہے
 جس سے حیوانات، جمادات، اور نباتات بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ راگ میں
 وہ اثر ہے کہ ہرن چکر لیاں بھرنا بھول جاتے ہیں، درندے رام ہو جاتے ہیں، لوہا موم
 بن جاتا ہے، سلاطین تخت و تاج ٹٹا بیٹھتے ہیں اور ہر ماہ قدموں میں لوٹنے لگتے ہیں،
 اور سب تو سب :

کتے راگ زینت ہے قرآن کا

یہ راگ کیا ہے ؟ ایک بات، ایک آواز، لیکن ایسی بات اور ایسی آواز جس میں
 کرامت چھپی ہوئی ہے اور جو کوئی اس بات کو پالیتا ہے حق کو پالیتا ہے :
 عجب راگ کا جگ میں بستار ہے ۛ شہد سوں مٹھا تر یو گفثار ہے
 جسے راگ کہتے ہیں او بات ہے ۛ ولے بات میں اس کرامت ہے
 اگر کوئی جو پالتا ہے اس بات کوں ۛ انپر تا ہے سچ حق کی اذوات کوں
 اس لیے شاہ معظم معنی اور مطرب کو آواز دیتے ہیں کہ وہ مجلس میں آئیں اور اپنی سیما نفسی
 کو کام میں لائیں :

اے مطرب بجاعود و بربط کے تار ۛ جو نکلے صدا تیں میں سب یاد یار

یوجیو اس صدا پر سوں قربان ہے ۛ جہاں مال و مہن ہو رہا امان ہے
 مفتی سنیا ہوں ترا خوش آواز ۛ کتے واز کرتا ہے سب دل کے راز
 اے مطرب اگر چنگ و لے دف سوں مل ۛ کرے رقص تو صاف ہوتا ہے دل
 کہ تا مست ہو و جد میں آئے ہیں ۛ ورا الورا پر گر جاوے ہیں
 مفتی غزل قول کچھ یاد کر ۛ کہدورت مرے دل سوں برباد کر
 رہوں شاد شاداں ہوں یار سوں ۛ کروں عشق مل اپنے دل دارسوں
 اے مطرب بجائے کتے جہاں گداز ۛ جو مستان کریں رقص کا ادھکے ساز
 کریں رقص ہو مست ات شوق سوں ۛ بسر دین دنیا کوں ات ذوق سوں
 مفتی ایسا کوئی ترانہ سننا ۛ جو ادھکے دل سوں یہ سب میں بنا
 سٹوں ہات سوں دھوکے ہستی کے کام ۛ رہوں سرنگوں ہو کے تابع شام
 اے مطرب دو تائے کوں دے گوشال ۛ ایسا دیکھ آتا ہے مجلس کوں حال
 تارے یوگانے بجانے او پر ۛ کتے مست چوتے ہیں شمس و قمر
 شاہ معظم راگ کو روح کا یار و مددگار سمجھتے ہیں اور ان کو یقین ہے کہ جرات عشق کا
 مداوا اسی سے ممکن ہے :

کتے راگ ہے یار اس روح کا ۛ میرے سار کے سچ ہے مجروح کا
 اس لیے مثنوی کو ختم کرتے ہوئے مفتی اور مطرب سے درخواست کرتے ہیں :
 دو فو یار مل دست گیری کرو ۛ دو فو یار مل جہد پوری کرو
 دو فو یار مل کار سازی کرو ۛ مرے بھر کے غم کو ماضی کرو
 اگر جا کے ملنا ہو اس ماہ کوں ۛ حقیقت کہو جا کے سب شاہ کوں
 مفتی تو محرم ہے سب راز کا ۛ معظم ہے عاشق سو آواز کا
 صوفی شعر پر حقیقت کا رنگ کچھ ایسا غالب رہتا ہے کہ وہ کبھی مجاز کی طرف آئے

بھی ہیں تو ان کی شاعری میں مجاز حقیقت کا عکس دکھائی دینے لگتا ہے۔ معظم کے زیرِ نظر
 ساقی نامے کا موضوع بہ ظاہر مئے و نغمے کا مجازی موضوع معلوم ہوتا ہے لیکن پوری مثنوی
 بار بار پڑھ جائے اس کے باوجود یہ تفسیر کا مشکل ہوگا کہ شاعر کے فکر و فن کو قوتِ محرکہ
 حقیقت سے مل رہی ہے یا مجاز سے۔ تاہم معظم کے یہاں یہ چیز کھٹکتی نہیں ہے،
 اس لیے کہ وہ مجاز و حقیقت کے تارِ حریر دو رنگ سے اپنی نظم کا تانا بانا تیار کرنے کا
 خاص سلیقہ رکھتے ہیں اور مجاز ہو یا حقیقت ان کی شاعری جذبات اور احساسات کی
 شاعری ہوتی ہے۔ وہ اصطلاحات کی زبان میں شعر کہتے ہیں اور نہ الفاظ کا طلسم باندھتے
 ہیں بلکہ تصوف کے نازک سے نازک مسئلے کو جذبات کی زبان میں بیان کرنے اور
 پیچیدہ مسئلہ کو سلیس اسلوب میں پیش کرنے پر قادر ہیں۔ زیرِ نظر ساقی نامے میں
 معظم نے سرور و سرود کا ذکر کچھ ایسے لہجائے ہوئے انداز میں کیا ہے جو بغیر شدید
 داخلیت کے ممکن نہیں۔ اسی شدید داخلیت کی وجہ سے ان کی زبان میں روانی اور اسلوب
 میں بے ساختگی پیدا ہو گئی ہے جو بہت کم صوفی شعرا کے کلام میں ملتی ہے۔

مفتاح الاسرار

شاہ معظم کی یہ مثنوی دراصل ان کی روحانی سرگزشت کا ایک باب ہے، جو بجاے خود مکمل ہے۔ اس مثنوی کے پانچ نسخے دست یاب ہوئے ہیں، جن میں سے ہر ایک پر اس کا ایک علاحدہ نام لکھا ہے۔ ان نسخوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ، حیدرآباد

مخطوطہ نمبر (۱۰۳) تصوف، تعداد صفحات (۲۲)، تعداد اشعار (۲۷۳) سرنامہ ہے اور نہ ترقیہ، البتہ کسی نے مثنوی کا نام "وجودیہ" لکھ دیا ہے۔ ہاشمی صاحب مرحوم نے بھی اپنی فہرست میں ہی نام دیا ہے۔ یہ کاغذ قدیم دہلی ہے اور کتابت خط ثلث میں ہے، جس سے اس نسخے کی قدامت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

مخطوطہ نمبر (۷۰) تصوف، تعداد صفحات (۱۶) تعداد اشعار (۲۷۳) ابتدائی صفحے پر مثنوی کا نام "مفتاح الاسرار" درج ہے، لیکن انجمن کے فہرست نگار نے کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، صفحہ ۲۰۱

نے مثنوی کا نام "مکتوب معظم یا مفتاح الاسرار" لکھا ہے۔ اس اضافے کی بظاہر وجہ وہ شعر معلوم ہوتا ہے، جس میں معظم نے اپنی مثنوی کو مکتوب معظم کہا ہے،
یو مکتوب معظم کہتے دیکھ عارف چھک کر رہتے
لیکن یہ مثنوی کا نام نہیں ہے، اس لیے کہ شاہ معظم اپنی نظموں کو بالعموم "مکتوب" یا "نامہ" کہتے ہیں،

یو مکتوب کیا جھاڑ ہے بار دار دیکھو سب یو وحدت سوں آیا ہے بار
یو نامہ جہاں میں ہوا جب ختم اگیارا صدی میں اتھے تیس کم تھے
یہ نسخہ ایک ناقص الطرفین فارسی مثنوی کے ساتھ مجلد ہے۔ فارسی مثنوی کے صرف دو ورق ہیں۔ چوتھے ورق سے شاہ معظم کی مثنوی شروع ہوتی ہے، لیکن اس کا آخری ورق جلد سازی کے وقت غلطی سے فارسی مثنوی کے اوراق کے بعد اور اصل مثنوی سے پہلے لگ گیا ہے، یعنی یہ حالت موجودہ جو ورق نمبر (۲) ہے وہ دراصل ورق نمبر (۱۱) ہے۔
صفحات کی ترتیب کا پتہ رکاب سے چلایا جاسکتا ہے۔

صفحات کی ترتیب کے اس معمولی انتشار سے قطع نظر یہ نسخہ مکمل ہے۔

۳۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

مخطوطہ نمبر (۶۹) تصوف، تعداد صفحات (۳۰)، تعداد اشعار (۲۷۳)
یہ نسخہ مخطوطہ نمبر (۷۳) تصوف کے ساتھ مجلد ہے۔ لوح پر "مکتوب حضرت

۱۔ اردو ادب، جلد ۴، نمبر ۲، بابت جون ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۴۱
۲۔ شجرۃ الاتقیاء، مخطوطہ نمبر (۱۳۱) تصوف، کتب خانہ نواب سالار جنگ، حیدرآباد
۳۔ معراج نامہ، کتب خانہ جامعہ مسجد ممبئی۔

سلطان معظمؒ لکھا ہے اور بھی نام فرست نگرانے بھی دیا ہے۔ ترقیہ حسب ذیل ہے:
 "تمت تمام شد، تاریخ بست و ششم ماہ مبارک محرم الحرام ۱۲۵۳
 ہجری ازید احقر العباد غلام حسین موذن نوشتہ شد"

۴۔ کتب خانہ قادریہ بادشاہ صاحب، حیدر آباد

تعداد صفحات (۲۵)، تعداد اشعار (۲۷۳)

یہ نسخہ اس مجموعے میں شامل ہے، جس میں شاہ معظمؒ کی ایک اور مثنوی آزادونامہ بھی ہے۔ لوح پر "طالب نامہ معظمؒ" لکھا ہے۔ اس نسخے کا سنہ کتابت ۱۲۶۰ ہجری ہے۔

۵۔ کتب خانہ درگاہ حضرت امین الدین علی اعظمی، بیجاپور

تعداد صفحات (۲۰)، تعداد اشعار (۲۷۳)

یہ انتہائی خستہ اور کرم خوردہ نسخہ ہے جس کی لوح پر مفتاح الاسرار درج ہے اور غلطی پر سنہ کتابت اس طرح لکھا ہے:

"در اوائل سال جلوس سید شاہ علی پیر ابن سید بابا شاہ حسینی

قدس اللہ سرہ العزیز تحریر نموده"

حضرت علی پیر ۱۱۱۹ھ ہجری میں سجادہ نشین ہوئے۔ قطعہ تاریخ جلوس حسب

ذیل ہے:

آفتاب آمد بدولت یا از صحابہ : شاہ آمد در جلوس کامیاب

چوں علی بعد از محمد در جہاں : آفتاب آمد وصی آفتابؐ

۱۔ رسالہ اردو ادب، بابت جون ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۱۱

۲۔ بیاض کتب خانہ درگاہ حضرت امین الدین علی اعظمی، بیجاپور

شاہ معظمؒ نے حضرت علی پیر کا ابتدائی زمانہ دیکھا ہے اور ان کی مدح بھی کی ہے۔
 اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ زیر نظر نسخہ ان کی زندگی ہی میں لکھا گیا ہے۔

گنج غفری کی طرح شاہ معظمؒ کی زیر تبصرہ مثنوی کا نام "وجودیہ" اور مکتوب معظمؒ بھی غیر موزوں معلوم ہوتا ہے۔ وجود کے مسائل زیر بحث آنے کے باوجود ان کی حیثیت مثنوی میں مرکزی نہیں ہے۔ اس مثنوی میں شاہ معظمؒ نے دراصل اپنی روحانی سرگزشت کا ایک باب پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ حضرت قادر لنگا کو تال کے مرید ہونے کے باوجود وہ اپنے دادا پیر حضرت امین کے طالب کیوں ہوئے اور حضرت امین نے انھیں کن کن مسائل کی تعلیم دی اور کس طرح مختلف مدارج اور مقامات طے کرائے۔ وجود کے مراتب و منازل اور ان کے اصرار و رموز اسی تعلیم و تربیت کے ضمن میں آگئے ہیں۔

اس لیے راقم الحروف کا خیال ہے کہ اس مثنوی کا نام وجودیہ کی بجائے مفتاح الاسرار یا طالب نامہ ہونا چاہیے، بلکہ ان دو ناموں میں بھی طالب نامہ زیادہ موزوں اور جامع نام ہے، لیکن اس مثنوی کے قدیم ترین نسخے میں جو کہ مصنف کی زندگی میں لکھا گیا ہے، اس کا نام "مفتاح الاسرار" درج ہے، اس لیے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کو "مفتاح الاسرار" ہی کے نام سے موسوم کیا جائے۔

جہاں تک موضوع کا تعلق ہے شاہ معظمؒ نے اس مثنوی میں بھی اپنے خانوادے کی تعلیمات بیان کی ہیں، لیکن مضامین کی ترکیب و ترتیب، بیان کے ربط و تسلسل، زبان کی شگفتگی و سلاست اور ہیئت کی خوش ترکیبی و ہم آہنگی نے ان میں نئی جان ڈال دی ہے اور ایسے قاری کو بھی جو خانوادہ امینیہ کے نصاب و نظام تصوف کی

۱۔ شجرۃ الاتقیاء مخطوط نمبر (۱۳۱) تصوف، کتب خانہ نواب سالار جنگ، حیدر آباد

۲۔ شجرۃ الاتقیاء مخطوط نمبر (۱۳۶) تصوف، کتب خانہ نواب سالار جنگ، دہلی

مخطوط نمبر (۱۷) دو دین کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ۔

ابجد سے تک ناواقف ہے، اس مثنوی کا مطالعہ گراں نہیں گزرتا بلکہ اظہار و اسلوب کی سلاست اور خوش آہنگی کا کچھ ایسا طلسم بندھتا ہے کہ اسی میں کھوکھو رہ جاتا ہے اور نئے معانی ہم اور غیر مانوس اصطلاحوں کی طرف اس کا ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا۔

مثنوی کا آغاز حمد سے کیا ہے، جو (۳۳) اشعار پر مشتمل ہے۔ حمد میں اسما و صفات کی چکولگی اور صوفیانہ نکتہ پردازی کی بجائے کائنات کی رنگارنگی اور مخلوقات کی بولبولی کا ذکر انتہائی لطیف اور شاعرانہ انداز میں کیا ہے اور ان آیات اللہ کے حسن کا دلکش مرقع کھینچ کر ذہن کو خالق کائنات کی عظمت اور اُس کی حسن کا رازِ رفعت کی طرف اس چابک دستی کے ساتھ راجع کیا ہے کہ دقیق سے دقیق مسائل اور نازک سے نازک نکات بیان کر کے بھی ایسی کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں۔

دکھنی شاعری میں حمد نگاری کی روایت بہت عام رہی ہے۔ مثنوی نگاری کی مقبولیت نے اس روایت کو اور چمکادیا۔ ان حمدیہ نظموں میں شعرا نے بڑا زور بیان صرف کیا ہے اور فکر و فن کا کمال دکھایا ہے۔ نعتی، غزلی، ابنِ نضال، صفتی اور عشقی وغیرہ کی پر شکوہ حمدیہ نظموں کا جواب نہیں ہے لیکن جو سادگی اور پرکاری، خلوص جذبات اور خوش بیان شاہِ معظم کے ہاں ملتا ہے وہ بہت کم کہیں اور نظر آئے گا۔ خصوصاً عجائباتِ عالم کی عکاسی کے جو سادہ لیکن دلکش مرقعے معظم کے ہاں ملتے ہیں کسی اور حمد میں نظر سے نہیں گزرے۔

مثنوی کا آغاز حمد کے ان اشعار سے جوتا ہے :

یو اللہ ناؤں پیارا ۛ دو عالم میرے سارا
یو ذاتی ناؤں کتے ہیں ۛ او جیتے توچر رہتے ہیں
تو قادر آپ کو اتا ۛ دو عالم کو توں بھاتا
اور عالم حج کو کہتے ۛ اور دُر میں تیرے رہتے

توں عالم حکمت پورا ۛ تمہیں کرتا کار اور حورا
حمد ہی کے سلسلے میں کارخانہ قدرت کے حیران کن عجائبات کا ذکر کرتے ہیں :
بن کھام منڈ کیوں چھایا ۛ اور قندلاں کیا خوب لایا
کر دیں سورج سے روشنی ۛ اور رات چندر سے گلشن
یو قطب دیکھو نہیں ہلتا ۛ نا ہلتا ہے نا چلتا
ہے چندنی رات ادھیاری ۛ کیا پیاری رہیں اندھیاری
غیر ذی روح عجائباتِ عالم کے ذکر کے بعد بڑی خوب صورتی سے گریز کرتے ہوئے وہ انسانوں کی طرف آتے ہیں :

جیوں زیب فلک پر تارے ۛ انسان زمیں پر سارے
کیا عالم حکمت کیتا ۛ یوں زیب و حرّت کو دیتا
کوئی نبی کیا کوئی مرسل ۛ تھے ایکس سوں ایک افضل
یو ولی کیا کیا پیارے ۛ ہیں ایکس سوں یک نیارے
شاعر چوں کہ انبیا اور اولیا کو مقصد کائنات اور حاصل موجودات تصور کرتا ہے، اس لیے اُن کو فرشتوں کی طرح روشن ستاروں سے تشبیہ دیتا ہے اور جمالِ روحانی کے ذکر کے بعد جمالِ جسمانی کی طرف رجوع کرتے ہوئے ہوشیارانہ عالم کے حسن کی سحر آفرینی کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے :

مشتوق کیا کیا بالی ۛ جیوں چھول کنول کی ڈالی
کیا میٹھی اس کی باتیں ۛ کیا کنول سری کے باتیں
کیا مین دیکھو رتنالی ۛ کیا کاکل گھنگر والی
کیا عاشق مد کی ماتی ۛ کیا ڈولتی خوب سہاتی
کیا باغال اور امرایاں ۛ کیا روتوں باروں آریاں

ابجد سے تک ناواقف ہے، اس مثنوی کا مطالعہ گراں نہیں گذرتا بلکہ اظہار و اسلوب کی سلاست اور خوش آہنگی کا کچھ ایسا طلسم بندھتا ہے کہ اسی میں کھو کر رہ جاتا ہے اور نئے معانی ہم اور غیر مانوس اصطلاحوں کی طرف اس کا ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا۔

مثنوی کا آغاز حمد سے کیا ہے، جو (۳۳) اشعار پر مشتمل ہے۔ حمد میں اسما و صفات کی چکولگی اور صوفیانہ نکتہ پردازی کی بجائے کائنات کی رنگارنگی اور مخلوقات کی بولبولی کا ذکر انتہائی لطیف اور شاعرانہ انداز میں کیا ہے اور ان آیات اللہ کے حسن کا دلکش مرقع کھینچ کر ذہن کو خالق کائنات کی عظمت اور اُس کی حسن کا رازِ رفعت کی طرف اس چابک دستی کے ساتھ راجع کیا ہے کہ دقیق سے دقیق مسائل اور نازک سے نازک نکات بیان کر کے بھی ایسی کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں۔

دکھنی شاعری میں حمد نگاری کی روایت بہت عام رہی ہے۔ مثنوی نگاری کی مقبولیت نے اس روایت کو اور چمکادیا۔ ان حمدیہ نظموں میں شعرا نے بڑا زور بیان صرف کیا ہے اور فکر و فن کا کمال دکھایا ہے۔ نعتی، غزلی، ابنِ نضائی، صنفی اور عشقی وغیرہ کی پر شکوہ حمدیہ نظموں کا جواب نہیں ہے لیکن جو سادگی اور پرکاری، خلوص جذبات اور خوش بیان شاہِ معظم کے ہاں ملتا ہے وہ بہت کم کہیں اور نظر آئے گا۔ خصوصاً عجائباتِ عالم کی عکاسی کے جو سادہ لیکن دلکش مرقعے معظم کے ہاں ملتے ہیں کسی اور حمد میں نظر سے نہیں گزرے۔

مثنوی کا آغاز حمد کے ان اشعار سے جوتا ہے :

یو اللہ ناؤں پیارا ۛ دو عالم میرے سارا
یو ذاتی ناؤں کتے ہیں ۛ او جپتے تو چر رہتے ہیں
تو قادر آپ کو اتا ۛ دو عالم کو توں بھاتا
اور عالم حج کو کہتے ۛ اور ڈر میں تیرے رہتے

توں عالم حکمت پورا ۛ تمہیں کرتا کار اور حورا
حمد ہی کے سلسلے میں کارخانہ قدرت کے حیراں کن عجائبات کا ذکر کرتے ہیں،
بن کھام منڈ کیوں چھایا ۛ اور قندیلوں کیا خوب لایا
کر دیں سورج سے روشن ۛ اور رات چندرے گلشن
یو قطب دیکھو نہیں ہلتا ۛ نا ہلتا ہے نا چلتا
ہے چندنی رات او جیاری ۛ کیا پیاری رہیں اندھیری
غیر ذی روح عجائباتِ عالم کے ذکر کے بعد بڑی خوب صورتی سے گریز کرتے ہوئے وہ انسانوں کی طرف آتے ہیں :

جیوں زیب فلک پر تار ۛ انسان زمیں پر سارے

کیا عالم حکمت کیتا ۛ یوں زیب و حرّت کو دیتا

کوئی نبی کیا کوئی مرسل ۛ تھے ایکس سوں یک افضل

یو ولی کیا کیا پیارے ۛ ہیں ایکس سوں یک نیارے

شاعر چوں کہ انبیا اور اولیا کو مقصد کائنات اور حاصل موجودات تصور کرتا ہے، اس لیے اُن کو فرشتوں کی طرح روشن ستاروں سے تشبیہ دیتا ہے اور جمالِ روحانی کے ذکر کے بعد جمالِ جسمانی کی طرف رجوع کرتے ہوئے ہوشیارانہ عالم کے حسن کی سحر آفرینی کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے :

معتشوق کیا کیا بالی ۛ جیوں چوں کنول کی ڈالی

کیا میٹھی اس کی باتیں ۛ کیا کنول سری کے ہاتیں

کیا مین دیکھو رتنالی ۛ کیا کاکل گھنگر والی

کیا عاشق کی ماتی ۛ کیا ڈولتی خوب سہاتی

کیا باغیاں اور امرا یاں ۛ کیا روتوں باروں آریاں

دیکھ سرور سہی کیوں ہلتے ۛ شمشاد چمن میں ڈولتے
یوں صدقہ ہوتے اوس پر ۛ جن جان دیا ہے تس پر
کیا ہری ہری ہریالی ۛ کیا نیلی، پسلی، کالی
کیا بھڑاں چھتوا چھائے ۛ پیر باروں جس فوائے
کیا لالہ لہلہاتا ۛ پھل پھولوں باغ سہاتا

حسنِ فطرت کے بیان سے بڑی خوب صورتی کے ساتھ گریز کر کے وہ نعت رسول
شروع کرتے ہیں۔ یہ گریز ایسا حسین اور فن کارانہ ہے کہ قصیدے کے گریز کا لطف
آجاتا ہے، اور یہ معظّم کے طرزِ بیان کی نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ ایک موضوع سے
دوسرے موضوع کی طرف ایسی چابک دستی اور لطافت کے ساتھ رجوع کرتے ہیں
کہ موضوع کی تبدیلی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اس مثنوی میں بھی اس کمالِ فن کے نونے
جلگ جگ ملتے ہیں، چنانچہ مخلوقاتِ عالم کی رنگارنگی کا ذکر کرتے ہوئے وہ حمد سے نعت
کی طرف یوں گریز کرتے ہیں،

یو خالق خلقت کیتا ۛ سرتاج نبی کے دیتا
یو کاج نبی کے سارا ۛ ہے نبی اللہ کا پیارا
ترلوک کیا اُس کا دن ۛ اُس کیتا دو جگ تارن

نعت کے بعد صحابہ، پنجتنِ پاک، دوازدہ امام اور چہارہ مصومین کو خراجِ
عقیدت پیش کرتے ہیں۔ یہ گویا تمہید تھی، جس کو ختم کرتے ہوئے وہ افسانوی انداز میں
اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک رات مجھے یہ فکر دامن گیر ہوئی
کہ انسان کی پیدائش کا کیا مقصد ہے؟ مجھے کس نے بنایا ہے؟ میں نے اس دنیا
میں آکر کیا کام کیا؟ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے آنکھیں عطا کی ہیں تو مجھے چاہیے کہ آنکھیں
دینے والے کو دیکھوں، اُس سے بات کروں اور پوچھوں کہ میرے اندر میں پن کا احساس

ہے تو یہ میں کون ہے؟

ایک رات فکر میں کیتا ۛ مجھ جنم کئے یو دیتا
کیا کام کیا میں آکر ۛ یو نعمت اُس کی کھا کر
یو بن دیا جنم کو ۛ میں دیکھوں بارے اُس کو
اس نینو اُس کو دیکھوں ۛ کیوں ایک کئے سو لیکھوں
کچھ اسی سول بولوں بارے ۛ جن سر جا عالم سارے
میں میں یو کہتا سو کون ۛ یہاں حق ہو رہتا سو کون

اسی ادھیڑ پن میں آنکھ لگ گئی اور میں نے خواب میں دیکھا کہ رسولِ کریم صلعم کی
بارگاہ میں حاضر ہوں۔ سرکار نے مجھے پیار کیا اور فرمایا کہ ہذا منی اور مجھے علم لدنی کی تعلیم
فرمائی۔ میں نے سر بہ زمین ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں آپ کے دوامِ حضور کا طالب
ہوں۔ اس کے سوا کوئی آرزو اب دل میں نہیں رہی۔ یہ سن کر حضور نے ارشاد فرمایا،
معلوم ہوتا ہے کہ تجھے خدا کی طلب ہے، اچھا اب بیجا پور جا، وہاں ایک مقام شہ پور
ہے، جہاں امین علی پیر رہتے ہیں، ان کا طالب ہو۔ میں نے حضور اکرم صلعم کے حکم کی
تعمیل کی اور حضرت امین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے اوامر و نواہی سے آگاہ اور
امرار و رموز سے باخبر کیا اور فرمایا کہ یہ بات میں امرِ نبی کی متابعت میں کہ رہا ہوں کہ لئے
معظّم تیرا پیر قادر ہے۔ وہ حاضر اور توانا ہے، اُس کو اپنے دل میں بسالے اور اس کا دامن
پکڑ کر راہِ سلوک اختیار کر۔

معظّم اس طرح حمد، نعت، منقبت، طلب حق، بشارتِ نبوی، حضرت امین
کی خدمت میں حاضری ادا ان کے حکم پر قادر لنگا کوتال سے اپنی وابستگی کا ترتیب وار
ذکر کرنے کے بعد اپنے دادا پیر سے حاصل کی ہوئی، سلوک و معرفت کی تعلیم کو اسی ترتیب
کے ساتھ بیان کرتے ہیں جو خانوادہِ امینیہ کے صوفیہ کا خاصہ ہے، لیکن ان بزرگوں اور

معظم میں یہ فرق ہے کہ وہ ایک معلم اور مبلغ کی طرح تفصیلات اور جزئیات کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے اور ساری تفصیلات، اصطلاحات کی زبان میں بیان کرتے ہیں۔ معظم صوفی ہی نہیں ایک خوش فکر اور قادر الکلام شاعر بھی ہیں، اس لیے وہ جزئیات اور تفصیلات میں الجھنے اور اصطلاحات کی زبان استعمال کرنے کی بجائے شاعرانہ زبان میں صرف اشارہ و ایسا سے کام لیتے ہیں، جس کی وجہ سے وہی باتیں، جو دوسروں کے ہاں علمی تعسف کے باعث بے کیف، جزئیات کی پیچیدہ تفصیل کی وجہ سے جیتاں اور اصطلاحات کی کثرت کی وجہ سے غیر دل چسپ اور ناقابل فہم ہو گئی ہیں، معظم کے ہاں شگفتگی اور تازگی، ندرت اور خوش آہنگی کا احساس پیدا کرتی ہیں بہر حال شاہ معظم اپنے خاندان سے کی روایت کی بہ موجب چاروں مراتب وجود ان کے مقام، ہاٹ، ذکر، قلب، روح، نفس، عقل، موکل، شہادت اور منزل کی وضاحت کرتے ہیں۔ وجود کے پہلے مرتبہ یعنی واجب الوجود کے ذکر میں اس کے دسوں خصائص بیان کرنے کے بعد چھ غفلتوں، سات مستیوں، پانچ جوہروں اور ان کے چھندوں کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔ یہ ان کے دادا پیر کا محبوب موضوع ہے، لیکن معظم نے تو اس کی تفصیل میں گئے ہیں اور نہ اس کو مثنوی کی طرح دہرایا ہے۔

ان خشک مسائل کے روایتی مباحث کو پیش کرنے میں معظم نے جو شاعرانہ اسلوب اختیار کیا ہے، اس کا اندازہ وجود کے چوتھے مرتبہ عارف الوجود کے مطالعے سے کیا جاسکتا ہے :

تھا منزل لاہوت دور + مجھ مانا دیکھ ضرور
تب عارف تازی چڑ کر + شمشیر تری ہست دھر کر
اون تازی لئی ہے پھنچل + ہے پھنچل اور لئی اچیل
اس تازی پر ہوا سوار + تب چڑ کر نکلا بھار

تھا ملہم یک مواس + میں اوس سوں با اخلاص
جب منزل لاہوت پہونچا + تھا جاگا لئی او اونچا
دھان دیکھا عزرائیل کو + تب دہشت لاگا دل کو
ہے بندے کا بھال لگ حد + بھال گھاٹ بجھ ان حد
مجھ حق نے کیت فاضل + القاب دیا تب واصل
اس کہتے سودھا بندہ + جن پایا شہادت شہدا
چوتھے مرتبہ وجود کے بیان کو معظم نے در بیان راہ معرفت کی سرخی دی ہے۔ اس مرتبہ کی دسوں خصوصیات بیان کرنے کے بعد وہ اس مرتبہ میں معرفت الہی کی تفصیل پیش کرتے ہیں :

اس کہتے خفی کا حال + اس کہتے قرب محال
بھال دیکھا بچوں اس کو + اور صاحب سمجھائس کو
ناہوش رہا کچھ مچ میں + حیران اتھا اس بوج میں
یا خواب کہوں بیداری + یا نیند کہوں ہشیاری
یا اللہ کہوں یا بندہ + یوں روشن دیکھ تجلا
او کیف مرے پر دائم + او دائم ہے اور قائم
مدہ ماتا تو چہ رہتا ہوں + اور دھان کا راز کتا ہوں
جوں سنا گز کے سینو + دوں دیکھا اپنے سینو
اس مرتبہ کی کیفیات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :

میں مدقہ امین علی کا + دو حق کے دیکھ دلی کا
مجھ سیدی راہ چلایا + میں پیر میں حق کو پایا
میں پیر میں حق کو دیکھا + برحق ہے حق کر لیکھا

اسی سلسلے میں کہتے ہیں کہ شیخ مظہر تجلیات الہی ہو تھے۔ سیر النبی شیخ
 یہی ہے کہ مرید شیخ کو صورت تشبیہ سمجھ اور اس میں تجلیات الہی کا مشاہدہ کرے۔
 اللہ تعالیٰ میرے شیخ کا بھیس بدل کر آیا ہے لیکن جس طرح ہر کارے کے بھیس میں بھی
 فو شاہ نے سکندر کو پہچان لیا تھا اسی طرح میں نے اپنے شیخ کو پہچان لیا ہے۔
 شیخ کو تجلی الہی کہنا کفر حقیقی ہے، لیکن عاشق اس کفر حقیقی کو عین ایمان جانتا
 ہے۔ معظم اپنے اس بیان کی تائید میں تہام کبار اولیا اور مشاہیر کے حوالے دیتے جاتے
 ہیں، جن میں سعدی، حافظ، حضرت غوث اعظم، شمس تبریز، مولانا روم، بابا بید بسطامی،
 معین الدین چشتی، قاضی عین القضا، منصور علاج، اور جنید بغدادی قابل ذکر ہیں۔
 معرفت نامہ کی کیفیات کی وضاحت کے بعد معظم ہار گاہ ایزدی سے اپنی سرفرازیوں
 کا ذکر کرتے ہیں۔ اپنے متعلق اس طرح کا اظہار اولیا سے کبار کا فائدہ رہا ہے، معظم کے
 بیان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سلوک و معرفت کی معراج کمال
 تک پہنچا دیا تھا:

میں اپس یونچہ گنوا یا : تب لذت کچھ میں پایا
 سب رویت مجھ پر کھولا : اور بات خفی کی بولا
 تھا مجھ پر پیار دل سوں : تھا مجھ پر رحم ازل سوں
 مجھ دے کر پانچوں گنج : کردہ سینے سوں رنج
 تب امت نبی کا کیتا : اور کتب علی کا دیتا
 حق دیکھ شجاعت میرا : تب کیتا پیار گھنیرا
 کئی بار لڑایا مجھ کو : کئی کھیت چڑایا مجھ کو
 اپ تاج فقر کا دیتا : اور سلطان معظم کیتا
 مجھ راز کیا حق ظاہر : مجھ اپنا کر کر ماهر

حق دیتا ج کو شاہی : ہے روشن مرغ و ماہی
 دے تاج فقر کا افسر : ہے پتر سر پر چھتر
 اس پتر میں کی کچھ دیتا : منگ عالم مجھ سوں لیتا
 میں مر مر کر پھر آیا : تب گنج خفی میں پایا
 میں مر مر چاروں تن سو : تب پایا لذت اس فن سو
 میں تو چہ تصرف کرتا : او نعمت کچھ میں سرتا
 میں جان تصدق دیتا : تب ج کو محرم کیتا
 اپنی سرفرازیوں کو گنانے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ یہ مقام یوں ہی حاصل نہیں ہوتا۔
 یہاں سر کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ اس سیر بھی پر سر کے بل چڑھنا پڑتا ہے، لیکن اس
 جاں نثاری اور سرفروشی کے باوجود مقصود کے پانے کی کوئی ضمانت نہیں۔ اللہ تعالیٰ
 جس کو چاہتا ہے، اسی کو سرفراز کرتا ہے۔

اس تصریح کے بعد وہ پھر ایک بار حمد و ثنا اور پنجتن پاک کا ذکر کرتے اور اپنے
 پیر قادر لنگا کے لطف و عطا کے بیان پر مثنوی کو ختم کرتے ہیں :

یو مکتوب معظم کہتے : دیکھ عارف چمک کر رہتے
 خود قادر پیار کیا ہے : مجھ رویت آپ دیا ہے
 میں عاجز اور میں مظلوم : او صاحب حق القیوم
 مجھ را کھا ناؤں معظم : اور اپنا کیتا محرم

جیسا کہ ابتدا میں وضاحت کی گئی ہے، شاہ معظم کی یہ مثنوی ہیئت کے
 اعتبار سے بہت منظم و مرتب ہے۔ ہیئت کی یہ تنظیم و تکمیل شاہ معظم کی
 مثنویوں کی اہم اور نمایاں خصوصیت ہے، جس سے ان کی فن کارانہ صلاحیتوں
 کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنی دوسری منظومات کی طرح شاعر نے اس مثنوی میں بھی بوجھل

اصطلاحات سے احتراز کیا ہے، یہی نہیں بلکہ روایتی مضامین اور مسائل کے بیان کو اپنے قلب کے گداز، جذبات کی پیش اور تخیل کی شوخی سے ایک نیا رنگ اور آہنگ بخشا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے صوفی شعرا کے برخلاف شاہ معظم کی شاعری فکر سے زیادہ جذبات اور احساسات کو تحریک دیتی اور قلب و نظر کو گرماتی ہے۔

دوسرے صوفی شعرا کی طرح معظم بھی اپنے عہد کے سرمایہ لفظی ہی سے استفادہ کرنے پر مجبور ہیں، لیکن ان کا ذوق شری اس سرمایے سے بڑے ہلکے پھلکے اور ملتے ہوئے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے، اور وہ ان الفاظ کو اس سلیقے سے بستے ہیں کہ خشک مضامین کی گرانی کے باوصف ان کی نظم جذبات کا سیل رواں معلوم ہونے لگتی ہے۔ تصوف کے علمی مضامین کے بیان میں زبان اور اسلوب کا یہ نکھار آج بھی فن کے اونچے سے اونچے معیار پر کمال سخن وری کی ضمانت ہو سکتا ہے۔

آزاد نامہ

شاہ معظم نے اس مثنوی میں مرو آزاد کے ظاہر و باطن پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مثنوی کے نسخے مختلف ناموں سے ملتے ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے :

۱۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ، حیدرآباد

مخطوط نمبر (۱۳۸) تصوف، تعداد و تصوف (۱۲)، تعداد اشعار (۱۴۷)
کاتب نے مثنوی اور مصنف کا نام کہیں درج نہیں کیا ہے، البتہ بعد میں کسی نے لوح پر گرج مخفی لکھ دیا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے بھی اپنی فہرست میں یہی نام بتایا ہے۔ کوئی ترقیمہ نہیں ہے، لیکن مثنوی کے خاتمے پر قطعہ تاریخ وصال حضرت فقیرہ المقدم باعلویٰ درج ہے اور ہندسوں کے علاوہ الفاظ میں بھی سنہ لکھا ہے :

۶۶۹ ہجری، شش صد و شصت و نہ سال بود۔ ناظم این تاریخ قاضی محمود است۔

اسی سلسلے میں بعد میں کسی نے یہ عبارت مستزاد کی ہے :

نوٹ : ابونصر فالدی صاحب نے کسی تہمدی یا تمارفی نوٹ کے بغیر اس مثنوی کو نوے ادب بابت اپریل ۱۹۵۷ء میں چھاپ دیا ہے۔ انھوں نے اگرچہ حوالہ نہیں دیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے شمارہ نظر عرف سالار جنگ کا مخطوط رہا ہے۔

۱ اور خلقت حضرت مذکور کی اب تک جاری ہے۔ سونے وغیرہ ۱۲۴۳ ہجری
آخری سنہ سے پتا چلتا ہے کہ زیر نظر مخطوطے کی کتابت ۱۲۴۲ ہجری سے پہلے
ہوتی ہے۔ کاغذ اور خط کے پیش نظر قرینہ اس کا ہے کہ اصل مخطوطے کی کتابت اس سنہ
سے بہت پہلے غالباً گیارہویں صدی میں ہوئی ہوگی۔
یہ نسخہ دراصل شجرۃ الاقنیا، گلزارِ چشت اور وجود العارفین کے ساتھ مجلد تھا،
لیکن اب علاحدہ کر دیا گیا ہے۔ یہ تمام رسائل ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے ہیں، خط
ثلث اور کاغذ قدیم دیسی ہے، جس سے اس کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے

۲۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ، حیدر آباد

مخطوط نمبر (۱۳۹) تصوف، تعداد صفحات (۹)، تعداد اشعار (۱۴۴)
یہ نسخہ شاہ معظم ہی کے ایک قصیدے اور الف نائے (سی حرف) کے
علاوہ شاہ برہان الدین جامی کی نظم وصیت الہادی کے ساتھ مجلد ہے۔ لوح پر آزاد نامہ
گفتار معظم لکھا ہے، لیکن ہاشمی مرحوم نے فہرست میں اس کا نام "کنج مخفی آزاد نامہ"
گفتار معظم بتایا ہے۔

۳۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ، حیدر آباد

مخطوط نمبر (۱۵۰) تصوف، تعداد صفحات (۱۳)، تعداد اشعار (۱۴۵)
یہ نسخہ تلاوت الوجود اور بعض مجہول الاسم رسائل کے ساتھ ایک مجرمے میں
شامل ہے، لوح یا خاکے پر مصنف اور مثنوی کا نام کہیں درج نہیں ہے، لیکن آخری

۱۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، صفحہ ۲۰۰

بیت میں اس کا نام قلندر نامہ بتایا گیا ہے۔

مرتب قلندر یہ نامہ تمام ۱۰۰ علیک الصلوٰۃ وعلیک السلام
یہ بیت کسی اور نسخے میں نہیں ہے۔ اس لیے اس کو الحاقی سمجھنا چاہیے۔ ہاشمی مرحوم
نے فہرست میں کنج مخفی نام بتایا ہے۔
اس نسخے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ آیات، احادیث، اور اقوال کی سرخیوں
کے تحت شعر لکھے گئے ہیں۔ بعض سرخیاں یہ ہیں،

خلقت الملائک من نور الانسان و خلقت الانسان من نوری
کنت کفراً مخفیاً فاجبت ان اعرف فخلقت الخلق

احمد بلا ميم

اللہ الغنی و انتم الفقرا

من کان فی ہذہ اعمیٰ لغوی الاخرۃ اعمیٰ

کاتب بدخط اور کم سواد ہے۔ بعض جگہ عربی عبارت کے ساتھ ہی شعر نقل کرنے شروع کر دیتے
ہیں، جس کی وجہ سے مصرعے مقدم موخر ہو گئے ہیں۔

۴۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ، حیدر آباد

مخطوط نمبر (۲۷) تصوف، تعداد صفحات (۱۱)، تعداد اشعار (۱۴۱)

"قصیدۂ قادر در مدح میراں جی شمس الحشاق" (بشارت الانوار) اور
شکار نامے کے ساتھ یہ نسخہ مجلد ہے۔ سرنامہ اور ترجمہ ہے اور نہ مصنف اور مثنوی
کا نام۔ ہاشمی مرحوم نے فہرست میں کنج مخفی نام بتایا ہے۔

۱۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، صفحہ ۲۰۱

۲۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، صفحہ ۲۰۱

۵۔ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد

مخطوط نمبر (۶۵۵)، تعداد صفحات (۸)، تعداد اشعار (۱۰۰)

یہ ناقص الاول نسخہ ہے، جس کا آغاز حسب ذیل شعر سے ہوتا ہے :
دیکھو حق سوں رہتے ہیں بے نیاز : دیکھو حق ہے ان پر اپس بانیاز
کوئی ترقیم نہیں ہے۔ ڈاکٹر زور نے گنج مخفی کے نام سے اس نسخے کو متعارف کرایا
ہے اور ان کا خیال ہے کہ اس کی کتابت بارہویں صدی کی ہوگی۔

۶۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

مخطوط نمبر (۷۳)، تصوف، تعداد صفحات (۱۰)، تعداد اشعار (۱۲۴)

اس مثنوی کے ساتھ شاہ معظم کی ایک اور مثنوی "مکتوب سلطان معظم" مجلد
ہے، جس پر سنہ کتابت ۱۲۵۳ ہجری درج ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ
زیر نظر نسخے کا سنہ کتابت بھی یہی ہوگا۔ اس نسخے پر مثنوی کا نام درج نہیں ہے
لیکن انجمن کے فہرست نگار نے گنج مخفی لکھا ہے۔

۷۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

مخطوط نمبر (۴)، تصوف، تعداد صفحات (۱۳)، تعداد اشعار (۱۵۰) اندازاً

یہ نسخہ انتہائی کم خوردہ ہے۔ جلتنگ پیر لگا کر محفوظ کیا گیا ہے۔ اکثر مصرعے
اور بعض شعر ضائع ہو گئے ہیں۔ سرنامہ نہیں ہے۔ ترقیم حسب ذیل ہے :

لے تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو، جلد اول، صفحہ ۱۲۸

لے رسالہ اردو ادب بابت جون ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۲۱

* تم تمام شد، بست و پنجم ماہ رمضان المبارک روز پنجشنبہ ۱۲۵۵

ہجری۔ کاتب الحروف فقیر الحقیر میخوار بندہ گنہگار بہ رحمت امیدوار۔
مثنوی کا نام کہیں درج نہیں ہے لیکن فہرست نگار نے گنج مخفی لکھا ہے۔

۸۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

مخطوط نمبر (۷۱)، تصوف، تعداد صفحات (۱۴)، تعداد اشعار (۱۲۸)

روح پر "این آزاد نامہ تصنیف معظم شاہ درج ہے، کوئی ترقیم نہیں ہے۔ اس
نسخے میں بھی مخطوط نمبر (۱۵۰) کتب خانہ نواب سالار جنگ کی طرح آیات، احادیث
اور اقوال کی سرخیاں قائم کر کے شعر لکھے گئے ہیں۔ انجمن کے فہرست نگار نے مثنوی کا نام
آزاد نامہ بتایا ہے۔

۹۔ کتب خانہ قادر بادشاہ صاحب، حیدرآباد

تعداد صفحات (۱۶)، تعداد اشعار (۱۲۸)

روح پر "آزاد نامہ" لکھا ہے، کوئی ترقیم نہیں ہے۔ یہ نسخہ ایک ضعیف مجموعے میں
خالدوہ امینیہ کے دوسرے بزرگوں کے رسائل نظم و نثر کے ساتھ شامل ہے، جن میں
سے بعض پر سنہ کتابت ۱۲۶۰ ہجری درج ہے۔

۱۰۔ کتب خانہ جامعہ نظامیہ، حیدرآباد

تعداد صفحات (۱۶)، تعداد اشعار (۱۲۸)

لے رسالہ اردو ادب بابت جون ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۲۱

لے رسالہ اردو ادب بابت جون ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۲۱

اس نسخے کی لوح پر مثنوی کا نام 'آزاد نامہ' درج ہے۔ کوئی ترقیہ نہیں ہے

۱۱۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی میں بھی محفوظ ہے۔ نام قلندر نامہ ہے۔

ابو نصر خالدی صاحب نے کتب خانہ نواب سالار جنگ اور کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو کے نسخوں سے اس مثنوی کا متن مرتب کر کے رسالہ قدیم اردو (جلد اول) میں شائع کر دیا ہے

شاہ معظم کی اس مثنوی کا پتا ہاشمی صاحب مرحوم نے چلایا تھا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اس کی (شاہ معظم کی) دو مثنویوں کا پتا چلا ہے، یعنی شجرۃ الاتقیا اور گنج مخفی۔ ان کو سرسری طور پر ایک کتب فروش کے پاس دیکھا تھا۔

معلوم نہیں ہاشمی مرحوم نے یہ نسخہ کس کتب فروش کے ہاں دیکھا تھا اور یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس نسخے کا کیا حشر ہوا۔ چونکہ ہاشمی مرحوم نے اس نسخے کی تفصیل

لے ۲۲۳، مجموعہ شش رسائل، نہرست خطوط، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، جلد اول، صفحہ ۴۰۵۔

لے ۱۱۱ میں اردو، چوتھی اشاعت، صفحہ ۲۱۲۔ ہاشمی مرحوم نے نام تو وہی مشہور کیا لیکن جو نمونہ کلام نقل کیا ہے، اس میں پہلے وہ شجرۃ الاتقیا کے ہیں، اس کے بعد کے آٹھ شعر مفتاح الاسرار کے اور آخری تین شعر آزاد نامہ کے ہیں۔ ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاشمی مرحوم نے جو بیاض دیکھی تھی اس میں شجرۃ الاتقیا اور آزاد نامہ (بقول ہاشمی مرحوم گنج مخفی) کے علاوہ مفتاح الاسرار بھی شامل تھی، لیکن انھوں نے شجرۃ الاتقیا اور مفتاح الاسرار کو ایک ہی مثنوی سمجھ کر شجرۃ الاتقیا کے ابتدائی دو شعر اور مفتاح الاسرار کے درمیانی چار اور خاتمے کے چار شعر نقل کیے ہیں۔

نہیں لکھی ہے، اس لیے اس کا بھی علم نہ ہو سکا کہ اس نسخے پر مثنوی کا نام 'گنج مخفی' درج تھا یا خود ہاشمی صاحب نے یہ نام تجویز کیا تھا

۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر زور نے اس مثنوی کے ایک ناقص الاول نسخے کو متعارف کرانے ہوئے بتا دیا تھا کہ یہ نسخہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے۔ چونکہ یہ نسخہ ناقص الاول ہے اور اس پر رسالے کا نام نہیں ہے، اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہاشمی مرحوم کی تقلید میں اس مثنوی کا نام 'گنج مخفی' بتایا ہے۔

حضرت امین کی پیروی میں ان کے خالوادے کے اکثر بزرگوں نے نظم و نشر کے متعدد رسالے گنج مخفی کے نام سے لکھے ہیں۔ گنج مخفی کنزاً مخفیاً کا ترجمہ ہے۔ اس نام کے رسالوں میں حدیث قدسی کُنْزاً مَخْفِیّاً فَاحِشِیَّتْ اَنْ اُخْرِفْ مَخْلَقَتْ رَا الْخَلْقِ کی وضاحت کرتے ہوئے کائنات کی تخلیق کے مدارج اور ان کے اسرار و رموز کی تشریح کی جاتی ہے۔ یہ خالوادہ امینیہ کا محبوب ترین موضوع ہے۔ گنج مخفی نام کے رسالوں کے علاوہ دوسرے رسائل میں بھی اس سلسلے کے بزرگ مہر تخلیق کی یہ بحث کسی نہ کسی عنوان سے چھیڑ دیتے ہیں۔ اس سے ہمارے محققین کو غلافی ہوتی ہے اور انھوں نے ان رسائل کو بھی جن میں یہ موضوع ضمنی طور پر زیر بحث آیا ہے گنج مخفی کا نام دے دیا ہے۔

زیر نظر مثنوی بھی اسی غلافی کا شکار رہی ہے۔ اگرچہ اس مثنوی کے کسی نسخے پر اس کا نام 'گنج مخفی' درج نہیں ہے، لیکن اس کو گنج مخفی کا نام دیا جاتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ دیرپہ سو ادبیات کی اس مثنوی میں، صرف چوتھے شعر سے آٹھویں شعر تک متذکرہ بالا حدیث کا مضمون ضمایماً بیان کیا گیا ہے اور بقیہ پوری مثنوی میں اولیاء اللہ کی قلندرانہ زندگی اور اللہ کے آزادانہ مزارع: مسلک کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے مثنوی کا متن متقاضی ہے کہ

اس کا عنوان آزاد نامہ جو اور جن نسخوں پر مثنوی کا نام درج ہے، آزاد نامہ ہی ہے۔
اس مثنوی کے جتنے نسخے دست یاب ہوئے ہیں، ان میں معظم کا تخلص، ان کے
پیر قادر لنگا اور دادا پیر حضرت امین کا نام موجود ہے۔
او قادر انوکا تو ساقی کہتے : پلاتا ہے مے بھر کے ساقی کہتے

مرے پر یوسب راز کھولے امیں : حقیقت انوکا یو بولا ہوں میں
معظم نے تب آکے سجدہ کیا : سدا ان کے نعلین سر پر لیا
اگرچہ مثنوی کے مختلف نسخوں میں اشعار کی تعداد مختلف ہے لیکن صحیح تعداد کا
اندازہ خود معظم کے بیان سے ہو جاتا ہے :

امر پر نبی کے یو کھولا ہوں میں : یوسب دیر سو بیت بولا ہوں میں
ڈاکٹر زور نے اس مثنوی کے موضوع کے بارے میں لکھا ہے :
زیر نظر مخطوطے میں ان ہی (حضرت امین) کے ایک مرید معظم نے ان کے
ملفوظات اسی طرح جمع کئے ہیں، جس طرح شاہ کمال الدین کے ملفوظات
شیخ محمد چشتی نے خمب ترنگ میں اور رحمت اللہ نائب رسول اللہ
کے ملفوظات ان کے مرید کمال نے فقر نامے میں منظوم کیے ہیں۔

ڈاکٹر زندگی یہ رائے درست نہیں ہے۔ شاہ معظم نے اس مثنوی میں حضرت امین
کے ملفوظات جمع نہیں کیے ہیں، بلکہ یہ ان کی طبع زاد مثنوی ہے، جو موضوع کی دل کشی
اور ہیئت کی جستی کی وجہ سے بیجا طور کے صوفیانہ ادب میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے زور اس کی ہیئت پر غور کیا ہے اور نہ اس
کے موضوع اور متن پر توجہ دی ہے بلکہ ادھر ادھر سے چند شعر پڑھ کر یہ رائے قائم کر لی

سہ تذکرہ ملفوظات ادارہ ادبیات اللہ، جلد سوم، صفحہ ۲۸۱

ہے کہ معظم نے اپنے پیر کے ملفوظات جمع کئے ہیں۔ حالاں کہ شاہ معظم نے اس نظم میں
فقر کی سبب درج، وضع قطع، طور طریق، مزاج و افتاد طبع، بے نیازی و استغنا، مدارج
و مقامات، ظاہر و باطن، بے سرو سامانی و طمانیت قلب، تعلق باللہ اور توجہ الی اللہ کا
ایسے دل کش اور شگفتہ انداز میں ذکر کیا ہے کہ ایک سچے قلندر کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں
میں پھر جاتی ہے۔

نظم کا آغاز حمد سے ہوتا ہے :

الہی تہنیں قادر ذوالجلال : توں صاحب جلیل یحییٰ الجہال
سمیع بصیر عظیم حکیم : توں خالق توں رازق رؤف الرحیم
توں دانا، توینا، علام الغیوب : توں مومن ہمیں کشاف القلوب

اس مختصر حمد کے بعد سر تخلیق کے بارے میں اچٹے سے اشارے کیے ہیں اور
پھر رسول اکرم معلم اور صحابہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد نفس موضوع کی طرف رجوع
کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا نے گہی کو امارت اور شان و شوکت سے سرفراز کیا ہے
اور کسی کو فقر و فاقے کی دولت عطا کی ہے۔ کسی کو امیر بنایا ہے اور کسی کو حقیر۔ اس کا رخا
قدرت کے عجائب و غرائب پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اس کی قوت تخلیق
کا ادنیٰ کرشمہ ہیں، لیکن ان سب میں مرد قلندر کا رنگ ہی زالا ہے :

ولے بے نوا کا عجب جوگ ہے : عجب جوگ بل بھوگ بھوگ ہے
چمن میں سو جیوں سر و شمشاد ہیں : فقیروں سے بونچہ آزاد ہیں
فقیری پہ قائم ہیں او مستقیم : امر جیوں، کسے میں نبی الکریم
اللہ کو او دنیا بچہ میں دیکھتے : دو دیکھتے ہیں تو ایک کر سیکھتے
اس لیے کہ وہ :

امر ہے خدا کا تو دنیا میں دیکھ : میں پھر تاہوں اکثر فقیروں کے بھیک

میں پھر تاپوں عالم میں جیوں ہے قمر ۛ سو جیوں چودوں رات دستا چندر
اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی بارگاہ نبوی میں رسائی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اسرارہ روز
کشمہ جہرے سے نقاب الٹ سکتے ہیں۔ وہ خلفائے کرام، متبعین پاک، دوازدہ امام کو
مانتے اور ان پر دل و جان سے درود بھیجتے ہیں۔ محی الدین ان کا سچا پیر ہے۔ وہ چشتی بھی
ہیں اور قادری بھی، بلکہ ان کی طلب حق ان کو ہر خانوادے سے استفادے پر مجبور کرتی ہے
اور وہ ہر ایک سے اکتساب فیض کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ بڑے صاحب دل اور صاحب قدرت
ہوتے ہیں، لیکن ہمیشہ نقر و فاقے اور تنگ دستی اور بے نوائی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔
اوشہ بانو اسچہ میں قدرت منے ۛ دیکھو کیوں اور بہتے ہیں غربت منے
سدا فقر و فاقہ تو دن رات ہے ۛ برگ بے نوائی پہ اوقات ہے
اس کے بعد ہی شاہ معظم نے دو عجیب شعر کہے ہیں:
دنیا دین سوں کام دھرتے نہیں ۛ کبھی حق کو بے زار کرتے نہیں
دیکھو حق سو رہتے ہیں کیوں بے نیاز ۛ سدا حق ہے ان سوا میں بانیاد
سلوک میں ترک مولیٰ کی بھی ایک منزل ضرور آتی ہے لیکن یہاں اس منزل کا ذکر
بھی نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے شاہ معظم کے ذہن میں عشق حقیقی کا وہ مقام ہو جہاں طالب
خود مطلوب اور محبوب بن جاتا ہے۔ اسی مقام پر فائز ہونے کی وجہ سے سیدنا عبدالقادر
جیلانیؒ کو محبوب سبحانی اور محشوق ربانی یا سید احمد رفاعیؒ کو معشوق اللہ کہا جاتا ہے، لیکن
یہ انداز بیان کہ "حق کو بے زار کرتے نہیں"، یا "دیکھو حق سو رہتے ہیں کیوں بے نیاز"
میں مفہوم کی بھی معاونت نہیں کرتا۔ خاص کر اس لیے بھی کہ وہ اگلے اشعار میں جوابات کہتے
ہیں وہ ان اشعار سے میل نہیں کھاتی:

مُرتی کی خدمت فرض جانتے ۛ مُرتی کو معبود کر مانتے
نفی کر اپس کو مُرتی منے ۛ مُرتی کو دیکھے ہیں رتی کئے

مُرتی سے مراد شیخ ہے۔ شیخ سے یہ نیاز مندی اور خدا سے بے نیازی، شیخ میں
یہ فتانیت اور ذات باری سے بے تعلقی سمجھ میں نہیں آتی
ہر حال ان لکچھ ہوئے اشعار کے بعد وہ مربوط اور مسلسل انداز میں اولیا اللہ کے
حالات و واقعات کا ذکر بڑے پُر جوش اور والہانہ انداز میں کرتے ہیں:

حضورِ سوں غائب او ہوتے نہیں ۛ عبث دم اونا چیز کھوتے نہیں
ہر ایک شے منے ایک کو دیکھتے ۛ اوسی ایک میں سب کو او لیکھتے
نفی کر اپس کو مُرتی منے ۛ مُرتی کو دیکھے ہیں رتی کئے
اگر کوئی (جو) ہوتا ہے خانی فی اللہ ۛ وہ ہر مقامے حق ہو کے باقی باندہ
عبادت او باطن میں کرتے مدام ۛ سدا صوم باطن میں دھرتے مدام
زباں سوں تو وہ ذکر جلی کریں ۛ اور دل میں سدا اپنے قلبی دھریں
کریں ذکر رومی اور ات شوق سوں ۛ اور بہتے ہیں سرتی منے ذوق سوں
خفی حال دائم ہے ان پر مدام ۛ فقیری دے نت او نو پر تمام
شریعت تو ان کا دیکھو قال ہے ۛ طریقت ان کا تو افعال ہے
حقیقت ہے احوال ان پر مدام ۛ دیکھو معرفت سب کھولیا ہے تمام
اس کے بعد مختلف حوالہ، ناموس، ملکوت، لاہوت، ہاہوت، میں اولیا اللہ
کی سیر کا ذکر کیا ہے۔ عالم ہاہوت کا نام لیے بغیر بڑے لطیف انداز میں کہتے ہیں کہ
ان کا وہاں لگ تو سر خدا ہے ۛ جہاں ہاجتا گھاٹ ان خدا ہے
یہی وہ لوگ ہیں جو مفرور وطن کرتے ہیں
سفر دیکھ ظاہر تو بیٹھے ہیں او ۛ دلے سیر باطن میں کرتے ہیں او

اسی طرح وہ باطن میں روزہ نماز ادا کرتے ہیں :

اگر تے ہیں باطن میں روزہ نماز : پھر کھولا ہے انوں پر تو راز و نیاز
خاوندہ امینیہ میں ہر فرض کا ایک باطن بیان کیا گیا ہے۔ شاہ معظم کی مراد یہاں
اسی باطن سے ہے لیکن جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ
یہ اولیاء اللہ ظاہر میں روزہ نماز ادا نہیں کرتے لیکن باطن میں وہ یہ تمام فرائض انجام دیتے
ہیں۔ ہمارے اس قیاس کی تائید اگلے شعر سے بھی ہوتی ہے :

بجز ان کو رویت تو کچھ کام نہیں : بجز حق کو دیکھ کے آرام نہیں
رویت حق کے انھیں طلب گاروں میں اقطاب، اولیا، اور اتقیا ہوتے ہیں۔
وہ چار تن کے شہید ہوتے ہیں، یعنی وجود کے چاروں مدارج میں انھیں فنا نیست
نفسیم ہوتی ہے۔ وہ سات مہستیوں کی نفی کرتے ہیں اور صرف بقا کی مستی میں
مگن رہتے ہیں، تن کے پانچ مودیوں کو قتل کر کے ان سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔

۱۔ خالیدی صاحب نے چار تنوں کے نام حقیقی، خارجی، ذہنی اور اسی بتائے ہیں۔

(قدیم اردو، جلد اول، صفحہ ۷۷) خاوندہ امینیہ کی اصطلاح میں یہ واجب الوجود، ممکن الوجود،
مستحق الوجود، اور عارف الوجود ہیں۔

۲۔ خالیدی صاحب نے بتایا ہے کہ سات مستیاں، جوانی، حسن، حکومت، دولت، شراب،
علم و ثروت ہیں، لیکن حضرت امین اور ان کے خاوندے کے بزرگ ان کی تفصیل یوں بیان کرتے
ہیں۔ پہلی مستی نسب کی، دوسری مستی وسیلے کی، تیسری مستی حسن کی، چوتھی مستی ہنرمندی کی، پانچویں
مستی علم ظاہر کی، چھٹی مستی مال و دولت کی، ادھ ساتویں مستی بادشاہی کی۔ یہ ساتوں مستیاں خالی
ہیں، انھیں مستی : یاد الہی کی ہے، اس مستی کو بقا ہے۔

۳۔ خالیدی صاحب نے پانچ مودیوں سے بکر، کینہ، غیبت، بغض اور حمد مرادی ہے لیکن
یہ اصل آنکھ، ناک، منہ، کان، زبان اور عضو تناسل (مرد) یعنی حواس خمسہ کے مقادیر ہیں
خالیدی صاحب نے غفلتوں کی تشریح نہیں کی ہے۔

چھ غفلتوں پر قابو پالیتے ہیں اور پانچ جوہروں کی حفاظت کرتے ہیں :

نفی سات مستیاں کی کرتے ہیں او : بقا ایک مستی سوں رہتے ہیں او
سدا چار تن او ہو کر شہید : کتے حق سوں پاتے ہیں غفلت جدید
مودی پانچ رہتے ہیں تن میں کبل : اول ان کو کرنا کتے ہیں قتل
پچھیں شش جہت سوں نکلتے ہیں ہمار : شہادت کے دریا سوں ہوتے ہیں پار
کتے پیچ غفلت ہیں انسان میں : ہزار اوچہ دیتے ہیں ایمان میں
اوسے دور کرتے سوچو سار میں : اوسے دور کرتے سواے یار میں
اُمارے کودل میں سوں کرتے ہیں دور : ہوا خمس کو مار کرتے ہیں چور
جو اہر کتے پانچ ہیں بے بدل : جتن خوب رکھتے ہیں ان کو اول
بڑے مرد بارے یو آزاد ہیں : دیکھو سب سوں نیارے یو آزاد ہیں
یہ مرد آزاد بقا کی مستی میں ایسے سرشار رہتے ہیں کہ انھیں زندگی کی کسی قیدہ بند
کی پروا نہیں رہتی۔ وہ ہمیشہ مفلس اور قلاشش رہتے ہیں، لیکن اپنا حال کسی پر ظاہر
نہیں کرتے۔ وہ محتاج الیہ صرف خدا کی ذات کو سمجھتے ہیں، اس لیے ساری مخلوق سے
استغنا برتتے ہیں۔ اس بھری دنیا کے غل و غش میں زندگی گزار دیتے ہیں، لیکن اس
سارے ہنگامے سے بے خبر اور بے نیاز رہتے ہیں۔ اسی حالت اور اسی کیفیت کو
اہل چشت غلوت در انجمن کہتے ہیں۔

جریڈے مجرور رہتے ہیں دیکھ : ہو غل غش سو فارغ مغرور ہیں دیکھ
یہ لوگ کسب معیشت کے لیے نہ دیں کو ذریعہ بناتے ہیں اور نہ دنیا کو، نہ وہ
کسی کے لیے چلے کھینچتے ہیں اور نہ نقش و تعوید لکھتے ہیں۔ نہ مالا جیتے ہیں اور نہ تسبیح
۱۔ خالیدی صاحب نے پانچ جوہر صوری، طبعی، عقلی، مادی اور نفسانی بتائے ہیں، لیکن ان
سے مراد دراصل ایمان، شرم، عقل، عبادت، (عمل) اور صبر ہیں۔

پھرنے میں، انھیں کہیں کی خواہش ہے اور نہ سیمیا کی، رزق، وہ طبابت سے دل چسپی
 لیتے ہیں اور نہ زراعت سے، بجز جھیک ان کا کوئی حیلہ معاش نہیں
 معظم غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اولیاء اللہ کسب معاش کے بکھیروں میں نہیں پڑتے۔
 بندگانِ خدا ان کی خدمت کر دیتے ہیں۔ بس اسی پر ان کی گزیر بسر ہوتی ہے۔ جھیک کا
 لفظ بھی غالباً انھوں نے توکل کے مفہوم میں استعمال کیا ہے، لیکن فقر کی بے نیازی اور
 استغنا کا جو ٹیکھا نقش اُبھار گیا ہے اس ایک لفظ سے اُس پر پانی پھر جاتا ہے۔
 بہر حال شاہ معظم اولیاء اللہ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ
 اس دنیا کی کھیتی کی فکر کرنے کی بجائے عاقبت کی کھیتی کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ وہ فخر
 و نحو جیسے علوم ظاہری سے بے بہرہ ہیں مگر مَن عَدَف کے درس میں مگن رہتے ہیں۔

نہ دھروں اور نہ فشتال بھریں ۞ نہ مالا جییں اور نہ سیج کریں
 نہ کرتے کدیں (دیکھ) او کیسیا ۞ نہ لیتے کدیں نام او سیمیا
 نہ دارو کریں کس کی ہو کر حکیم ۞ سمجھتے ہیں حق کو غفور الرحیم
 نہ کھیتی کریں اور نہ سیجیں ملا ۞ بجز جھیک دیگر نہیں کچھ حسیلا
 زراعت کریں مزرعہ الآخرہ ۞ تجارت کریں ملت الباہرہ
 نہ او علم پڑتے نحو صرف کا ۞ سدا درس لیتے ہیں مَن عرف کا
 او تعویذ طوار کرتے نہیں ۞ کرامت دیکھا پیٹ بھرتے نہیں
 شاہ معظم نے اب تک جو تفصیل بیان کی ہے وہ شریعت سے متناقص نہیں
 ہوتی لیکن اگلا بیان محلِ نظر ہے۔

ترک کر کے سب کفر اسلام کو ۞ رکھے ہیں مرقی کے یک نام کو
 نہ ہمدی، نہ سنی، نہ اوافاجی ۞ نہ دہری، نہ یزدی، نہ اورافضی
 فقیری دیکھو (ان پر) کیا بار ہے ۞ یورندی انوپو سزاوار ہے

یعنی، ان پر فقر سے زیادہ رند کا لفظ صادق آتا ہے، اور :

نہی لے کچھ ان کو مذہب نہیں ۞ یوصوفی ہیں مذہب سو مطلب نہیں
 او ظاہر تو ہیں رند طوطہ نماں ۞ ولیکن ہے باطن میں امن دماں
 یو ظاہر لیے جھیک جھگو ان کا ۞ ولے کھیل باطن میں سجان کا
 مقرب سدا حق مومن رہتے ہیں او ۞ وہی حال اور قال رکھتے ہیں او
 یہ صحیح ہے کہ جو فقرا مغلوب الحال ہوتے ہیں وہ تکلیف شرعی کے بجالانے سے
 معذور رہتے ہیں، لیکن یہاں شاہ معظم کا اشارہ صوفیہ کی مغربیت کی طرف نہیں معلوم
 ہوتا، بلکہ وہ صاف الفاظ میں یہ کہہ رہے ہیں کہ صوفیہ او امر و نواری کی پابندی سے آزاد ہونے
 ہیں اور اپنے بیان کی تائید میں ایک موضوع حدیث سے استدلال بھی کرتے ہیں کہ صوفیہ
 کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اس سے زیادہ دل چسپ بات وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ فقرا ظاہر
 جھگو ان کے جھیں میں نظر آتے ہیں، لیکن یہ سب بہ باطن سجان کا کھیل ہے۔ معظم
 غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان کا ظاہر غیر مسلموں کا ساس ہے لیکن باطن مسلمان ہے۔ آزاد مشرب
 فقر کی اس دل چسپ صفت کے بیان سے ہم یہ قیاس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ
 شاہ معظم کے ذہن میں اپنے شیخ قادر لنگا کوتال کی تصویر ہے، جن کے بارے میں
 تذکرہ نگار کہتے ہیں کہ وہ اپنے پاؤں لنگ باندھتے تھے، ممکن ہے کہ وضع قطع بھی لنگائیوں
 کی سی بنا رکھی ہو۔ معظم اپنے شیخ سے والہانہ محبت کرتے تھے، ان کی شایہ ہی کوئی
 نظم اور غزل ہوگی، جس میں انھوں نے اپنے شیخ کا ذکر نہ کیا ہو۔ اس لیے خیال ہوتا ہے
 کہ اس شغری میں جس مردِ آزاد کی پرچھائیاں ملتی ہیں، اور جس کے ذکر سے معظم کی گئی گرفتار
 قائم ہے، وہ قادر لنگا ہی ہوں گے۔

شاہ معظم نے عمومی انداز میں فقرا کو جن صفات سے متصف کیا ہے، اس سے
 ہم اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن ان کے معبودِ ذہنی کی پیش نظر رکھا جائے تو اس اختلاف

کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ معظم کے دل و دماغ پر جس فقیر کا تصور چھایا ہوا ہے وہ اسی کو مثالی فقیر سمجھنے میں حق بہ جانب ہیں۔ اس لیے اگر وہ اپنے اس مثالی فقیر کے حال اور حیلے کو تمام فقرا پر منطبق کرتے ہیں تو یہ عین تقاضائے عشق ہے۔ فنا فی الشیخ سے اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

ہمارے اس خیال کی تصدیق مشنوی کے آخری حصے کے ایک شعر سے بھی ہوتی ہے جس میں معظم صاف صاف کہتے ہیں :

او قادر انوں کا تو ساقی کتے ۛ پلاتا ہے مئے بھر کے باقی کتے
نہی قادر لنگا ان فقرا کے سرگروہ ہیں اور وہی ان کو معرفت کی شراب پلاتے ہیں۔
فقرا کی اس آبادی کے سلسلے میں معظم کہتے ہیں :

دنیا کے ہیں طالب معرفت کتے ۛ ہیں جنت کے طالب مومن کتے
جو طالب خدا کے سوا مرد ہیں ۛ جو کوئی مرد ہیں اوچر پر درو ہیں
بہی لوگ ہادی ہیں رہبر کتے ۛ انوکھ نر ہو کر مذکر کتے
جب شیخ ان فقرا پر ہیں کاراز منکشف کر دیتا ہے تو وہ فضاے معرفت میں
شہ باز بن کر پرواز کرنے لگتے ہیں۔ یہ فقرا معرفت کے مقاماتِ جلیلہ پر فائز ہوتے
ہیں لیکن ہمیشہ اپنے علو سے مرتبت کو چھپائے رکھتے ہیں :

او محیط کتے کون، او مطلق ہے کون ۛ او بندہ کتے کون، ہو حق ہے کون
مرے میں یو میں میں کتا کون ہے ۛ مرے میں خدا ہو رہتا کون ہے
یو مرشد سوں سنتے ہیں جب راز او ۛ تو دستے ہیں عالم میں شہ باز او
او زاہد ہیں عارف ہیں عاشق کتے ۛ او اصل ہیں دستور سابق کتے
لیکن اپس کو چھپاتے ہیں اد ۛ دیکھو توچہ عالم کو بھاتے ہیں او
ان کی وضع قطع، ان کے طور طریق اور ان کے اطوار کا حال یہ ہے :

سرو پا برسنے او چھرتے ہیں دیکھ ۛ دیکھو گنبد کر سر کو دھرتے ہیں دیکھ
دیکھو سرگذشتہ ہیں کیا بے ریا ۛ نہیں کچھ اوفو میں دیکھو رو ریا
او جنت سوں کچھ کام دھرتے نہیں ۛ جہنم سوں کچھ پاک دھرتے نہیں
اکاڑی بچھاڑی او رہتے نہیں ۛ بچی ہو راونچی کس کی سبتے نہیں
بزرگی کو اپنی رکھے عرش پر ۛ دیکھو بھیک منگتے ہیں کیوں در بدر
سدا اپنے باطن میں کرتے سجود ۛ ہمیشہ وہ کرتے تلاوت و جود
و عابد و عاکس کو دیتے نہیں ۛ وہ پونجی ٹکا کس سے لیتے نہیں
اسم با مسما ہے ان پر گدا ۛ دیکھو کیوں وہ رہتے ہیں مفلس سدا
نفی ذات میں ہو کے اثبات ہیں ۛ او آزاد ہیں اور ان ذات ہیں
خانوادہ انبیاء میں سب سے افضل عبادت تلاوت و جود یعنی اپنے تن کا عرفان
ہے۔ تن کے عرفان ہی سے حق کا عرفان ہوتا ہے۔ شاہ معظم بھی اسی عرفان و آگاہی پر زور
دیتے ہیں :

سدا اپنے باطن میں کرتے سجود ۛ ہمیشہ وہ کرتے تلاوت و جود
اول اپنے تن کی وہ کرتے شناس ۛ کتے توچہ ہوتے ہیں او حق شناس
تلاوت و جود کے بعد وہ مرد آزاد کی حضوری قرب اور فنایت کا ذکر کرتے ہوئے
فقر کے اعلیٰ ترین مرتبے کی دفاحت کرتے ہیں :

امر ہے تمہیں حق سے یاری کرو ۛ حضوری نپٹ جاں نثاری کرو
اویسی وضع یاری یو کرتے ہیں یار ۛ سدا یار پر دیکھ ہوتے نثار
ملا تے ہیں او نو کو نور میں ۛ ندی جوں کے لقی ہے سدر میں
خدا سات بل بل کے ہوتے ہیں ایک ۛ اویسی کا دیکھ اوچہ لیتے ہیں بھیک
خدا سات ملنے کو یک وقت ہے ۛ نبی نے کہے وقت او سخت ہے

نہ وہاں کچھ وساطت نہ کس کا گزر ۞ ملائک مقرب نہ مرسل دگر
سدا دھال انوکا کتے سبر ہے ۞ سدا دھال انوکا دیکھو طیر ہے
دہاں جا کے میں توں سوں جلتے گزر ۞ بجز حق کتے داں نہیں کچھ گزر
خدا باج داں کوئی بستا نہیں ۞ خدا باج واں کوئی بستا نہیں
عجائب یو منزل ہے لاہوت کا ۞ وہاں غفلہ سب ہے ہاہوت کا

یو مردان حق کچھ خدا تو نہیں ۞ ولیکن خدا سے جدا بھی نہیں
سدا عیش کرتے ہیں مل یار سوں ۞ سدا مل کے رہتے ہیں دل دار سوں

فقیری عنایت ہدایت سوں ہے ۞ عطا سب کو شاہ ولایت سوں ہے
فقیری عنایت نبی پر کیا ۞ یہی دلق حلاج میں حق دیا
شاہ معظم شنوی کے آخری حصے میں قاری کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اے
سالک وجود کے چار مدارج ملے کیے بغیر معرفت تامہ نصیب نہیں ہوتی اور جو سالک
یہ منازل ملے کہ لیتا ہے وہی دراصل نبی کا فرزند یعنی محبوب ہے :

وجہ چار یو تجھ پوچھے ہیں چار ۞ وجود سوں جدا کر آپس دیکھ بھار
یہی چار منزل عجب راہ راس ۞ اسی رہ سوں آتے ہیں سب چل کے فاس
کتے ہیں نبی کا او فرزند ہے ۞ جو یوں چل کے آتا سوں دل بند ہے
اسی رہ سوا کے ہوئے ہیں وہ پیر ۞ اسی رہ سوں چلتے ہیں سامے فقیر
تو سب کشف دستا ہے ان پر دام ۞ علیہ الصلوٰۃ وعلیہ السلام

آخر میں وہ اپنے پیر قادر لنگا کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ میں نے امیر رسول کی
متابعت میں بیڑھ سو شعر کہے ہیں اور ان امرا و رموز کو بیان کیا ہے جن کا انکشاف مجھ پر

حضرت امین نے فرمایا ہے۔

میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم، امین الدین علی اعلیٰ اور ان کے خلفا
نے نظم و نثر کا جو سرمایہ چھوڑا ہے وہ دین کے مسائل بالخصوص تصوف کے مباحث کی
تشریح و تفہیم کی ان تک سماعی کا نتیجہ ہے۔ معظم کا تعلق بھی اسی خانوادے سے ہے،
اور وہ بھی اسی خانوادے کی تعلیمات کو نظم کرتے ہیں، لیکن معظم صرف مبلغ اور صوفی نہیں قادر الکلام
شاعر بھی ہیں۔ انھوں نے تصوف کے موضوعات پر شنویاں ہی نہیں لکھی ہیں بلکہ غزل کا
ایک ضخیم دیوان بھی یادگار چھوڑا ہے۔ وہ حقیقت کے رمز آشنا ہی نہیں غالباً حجاز کے
تیر ستم کے گھائل بھی تھے اور یہ وہ خصوصیات ہیں جو ان کو اپنے خانوادے کے دوسرے
شاعروں سے ممتاز کرتی ہیں۔

زیر نظر شنوی میں انھوں نے صوفیہ کے حال و قال ظاہر و باطن، وضع قطع اور طور
طریق بیان کیے ہیں اور ضمناً مختلف مسائل بھی چھیڑ دیے ہیں، لیکن زور بیان کا یہ عالم ہے
کہ نظم ٹٹاٹھیں مارتا سمندر معلوم ہوتی ہے اور روانی کی یہ کیفیت۔ بہ کہ شنوی شروع کرنے
کے بعد ختم کرنے تک ہاتھ سے نہیں چھوٹی۔ اگرچہ اس شنوی میں کوئی خاص ادبیت نہیں
ہے لیکن جس کو گیارہویں صدی کی صوفیانہ شاعری کے مطالعے کا موقع ملا ہے وہ اندازہ
کر سکتا ہے کہ معظم کو زبان و بیان پر کتنی قدرت تھی اور ان کے ہاں مذہبی اور خشک موضوعات
کے بیان میں بھی کیسی جستی، شگفتگی، بے ساختگی اور دل آویزی پائی جاتی ہے۔

اس شنوی کی ایک دل چسپ خصوصیت یہ ہے کہ اس میں متعدد شعر ایسے ملتے
ہیں جن میں حروف ربط اور افعال کی قدیم شکلوں کو بدل دیا جائے تو ان کی زبان آج کی
زبان معلوم ہوگی :

دنیا دین سوں کام دھرتے نہیں ۞ کبھی حق کوں بے زار کرتے نہیں
سدا عیش کرتے ہیں مل یار سوں ۞ سدا مل کے رہتے ہیں دل دار سوں

گلزارِ چشت

کتب خانہ نواب سالار جنگ، عظیم پورہ نمبر (۱۳۱) تصوف۔

یہ عظیم شاہ معظم کی دو مشنویں، شجرۃ الاتقیاء اور گلزارِ چشت پر مشتمل ہے۔ اس طرح کہ پہلے شجرۃ الاتقیاء ہے: اس کے خاتمے پر دوسرے صفحے سے بنیم اشجار المتعین التاجیم لکھ کر رسالہ گلزارِ چشت شروع کیا گیا ہے۔ دونوں مشنویں کی تصحیح پر ان کے نام درج نہیں ہیں، لیکن شاہ معظم نے شجرۃ الاتقیاء کے ابتدائی حصے میں اور گلزارِ چشت کے آخری آیات میں رسالوں کے نام دے دیے ہیں:

ہوا نجم امر خاتم الانبیاء + اسے نام رکھ شجرۃ الاتقیاء

مبارک رکھا نام گلزارِ چشت + پڑھے یا سنے سودہ پاوے بہشت

شاہ معظم نے گلزارِ چشت کے اشعار کی تعداد چار سو بتائی ہے:

یہ سب چار سو دیکھ آیات ہے + شہد سو مثنوی ترہر یک بات ہے

لیکن زیرِ نظر نسخے میں صرف (۲۷۰) آیات ہیں۔ یہ نسخہ (۳۱) صفحات پر مشتمل ہے

ترقیمہ، تمت تمام شد تحریر فی التاریخ نہیم ماہ ربیع الآخر، روز جمع (جمعہ) وقت

دوبہار انصرام رسید از خط خام سید مجتہد ہاشمیان

شجرۃ الاتقیاء اور گلزارِ چشت دونوں مشنویں کی نوعیت منظوم تذکروں کی ہے۔ اول الذکر مشنوی میں حضرت خواجہ بندہ نواز سے علیٰ پیر تک بندہ نوازی سلسلے کی

حضورِ سولِ غائب او ہوتے نہیں + عبث دم او ناہیز کھوتے نہیں
بزدگی کوں اپنی رکھے عرش پر + دیکھو جیک ٹنگتے ہیں کیوں در بدر
ہر اک شے سنے ایک کو دیکھتے + اسی ایک میں سب کو او لیکھتے
اس سے زیادہ دل چسپ بات یہ ہے کہ بعض شعرا ایسے بھی مل جاتے ہیں جن کی زبان بالکل آج کی زبان ہے:

یہ حروان حق کچھ خدا تو نہیں + لیکن خدا سے جدا بھی نہیں

ہمیشہ وہ فلاکش مفلس رہیں + زندہ حال اپنا کسی سے کہیں

زندہ علم پڑھتے تھو صرف کا + سدا درس لیتے ہیں من عرف کا

زبان کی اس تراش فراش کی وجہ سوائے اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ قادر الکلام شعرا کا وہ ذوق جو الفاظ اور جملوں کے انفرادی اور اجتماعی آہنگ کا ادراک کرتا ہے، ایسی سلیس و سبک زبان لکھنے کی طرف غیر شعوری طور پر ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

QASID KITAB GHAR

Mohammad Hanif Razvi Nagarchi
Near Jamia Masjid, Arcot Dargah,
BIJAPUR-586104, (Karnataka)

بیجا پدی شاخ کے تمام بزرگوں کا ذکر ہے اور مؤرخ الذکر میں حضرت خواجہ اجیری سے حضرت برہان الدین غریب اور ان کے خلفا تک تمام سربراہ آورده شیوخ سلسلہ کا حال قلم بند کیا ہے۔ ان دونوں تذکروں کے مطالعے کے بعد جو خیال معاہدہ میں آتا ہے۔ وہ یہ کہ گلزارِ چشت کو پہلے اور شجرۃ الاتقیاء کو بعد میں نقل ہونا چاہیے تھا، بلکہ شجرۃ الاتقیاء کو ایک علاحدہ رسالے کی صورت دینے کی بجائے گلزارِ چشت ہی کے سلسلے میں لکھا جانا چاہیے تھا، لیکن دونوں رسالوں کی علاحدہ اور مستقل حیثیت صاف بتاتی ہے کہ یہ تقدیم و تاخیر کاتب کی نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں شاہ معظم کے پیش نظر صرف خانوادہ میراں جی شمس العشاق کا تذکرہ قلم بند کرنا تھا۔ اس لیے انھوں نے اس خانوادے کے سرچشمہ فیض حضرت بندہ نواز گیسو دراز سے شجرۃ الاتقیاء کا آغاز کیا اور حضرت عماد الدین مغربی، حضرت کمال الدین بیابانی، حضرت شمس العشاق، حضرت شاہ برہان الدین جامن، حضرت امین الدین علی اعلیٰ، حضرت بابا شاہ حسین، اور حضرت علی پیر کے حالات و کمالات کو بیان کر کے نظم کو ختم کر دیا۔ غالباً اس نظم کی تکمیل کے بعد انھیں احساس ہوا کہ اس سلسلے کی ابتدائی کڑیوں کو بھی جوڑنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے گلزارِ چشت لکھی اور اس میں حضرت خواجہ اجیری سے حضرت برہان الدین غریب نواز تک، اس سلسلے کے بزرگوں کا حال قلم بند کیا۔ زمانہ تصنیف کے اسی تقدیم و تاخیر کی وجہ سے زیرِ نظر خطوطے میں پہلے شجرۃ الاتقیاء ہے اور اس کے بعد گلزارِ چشت نقل کی گئی ہے۔ اس قیاس کی تائید حسب ذیل امور سے بھی ہوتی ہے :

(۱) شجرۃ الاتقیاء میں حمد، نعت، واقعہ، معراج کا ذکر اور صحابہ کی منقبت جس تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے وہ گلزارِ چشت میں نہیں ملتی بلکہ ان موضوعات پر صرف چند شعر ہیں۔

(۲) شجرۃ الاتقیاء میں بزرگانِ سلسلہ کے حالات و کمالات جس تفصیل، غلوں اور والہانہ پن کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، گلزارِ چشت میں نہ تو وہ تفصیل ہے اور نہ وہ

جو شش بیان۔

(۳) شجرۃ الاتقیاء میں سبب تصنیف کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ یہ رسالہ رسول اکرمؐ کے حکم کی تعمیل میں لکھ رہے ہیں، گلزارِ چشت میں ایسا کوئی سبب نہیں بیان کیا ہے البتہ مشنوی کے آخری حصے میں اپنے پیر حضرت امین کی مدح کے سلسلے میں لکھا ہے کہ انھیں کی برکت سے یہ تمام رموز مجھ پر آشکار ہوئے ہیں اور انھیں کے امر سے میں نے یہ اسرار و رموز بیان کیے ہیں :

ہوا رازِ مکشوف سب آشکار ۛ تسلوا ہوا دل نے پایا قرار
امر پیر کا تھا سو بولا ہوں میں ۛ چھپے راز تب لا کے کھولا ہوں میں
یو سب چار سو دیکھ ابیات ہے ۛ شہد سو مٹھی تر ہر یک ہات ہے
مبارک رکھا نام گلزارِ چشت ۛ پڑے یا سنے سو وہ پاس ہے ہشت
ظاہر ہے کہ سلوک و معرفت کے اسرار کی تشریح و تفسیر کا حکم کوئی خصوصاً حکم نہیں ہے، بلکہ ہر شیخ اسی فریضے کے انجام دہی کی تاکید و تلقین کرتا ہے، اس لیے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ متذکرہ صدر اشعار سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ رسالہ گلزارِ چشت شاہ معظم نے پیر کے حکم پر لکھا ہے۔

اس تشریح سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ شاہ معظم نے خود ان کے بیان کے مطابق رسول اکرمؐ کی ایما پر شجرۃ الاتقیاء لکھی۔ مشنوی کا یہ نام بھی حضور اکرمؐ کا دیا ہوا ہے۔ اس مشنوی کی تصنیف کے بعد اوپر کے سلسلے کی تکمیل کی غرض سے انھوں نے گلزارِ چشت قلم بند کی۔ شجرۃ الاتقیاء میں حضرت علی پیر کے حالات و کمالات کا تذکرہ بھی ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رسالہ بارہویں صدی کے تیسرے دہے میں لکھا گیا۔

گلزارِ چشت چوں کہ شجرۃ الاتقیاء کے بعد لکھی گئی ہے، اس لیے اس کا زمانہ تصنیف بھی یہی ہوگا۔

گلزارِ چشت کا آغاز حسب ذیل اشعار سے ہوتا ہے :

الہی تو عالم علام الغیوب + تو مومن، مہمین، کشف القلوب
سدا حق و قیوم، قادر ہے تو + ہمہ وقت حاضر سوا نظر ہے تو
تو دانا تو بینا ہے صاحبِ کریم + تو خالق، تو رازق، رؤف الرحیم
تو حاکم ہے حکمت میں روشن ضمیر + ہر ایک ایک حکمت ترا بے نظیر
فلک کا مندف خوب چھایا ہے تو + سورج چاند قندیل لایا ہے تو
سورج (سول) دیکھو روز روشن کیا + رین سول ستاروں کو گلشن کیا
دیادہ صحت کو دھیر پانی اوپر + دیکھو عام سفر اچھا تاس اوپر
جہ کے بعد مرتبہ گنج مخفی سے ذات احد کے نزول کو بیان کرتے ہوئے حقیقت محمدی
کی اس طرح وضاحت کی ہے :

احد تھا سو برحق وہ احمد ہوا + وہی دیکھ احمد محمد ہوا
ازل سول اول حق نبی کو کیا + دیکھو تب نبی کو خلافت دیا
اپنے اپنا ذوق لینے بدل + اپنے خود دو کیا ہے باہر نکل
اس کے بعد نعت میں چند شعر کہے ہیں اور اسی سلسلے میں واقعہ معراج کو بھی
بیان کیا ہے۔ خلفا کی منقبت صرف ایک شعر میں کی ہے۔ شجرۃ الاتقیاء میں چاروں
صحابہ کی منقبت تفصیل سے کی ہے۔ حضرت علی کی مدح صحابہ کے ساتھ بھی کی ہے اور
علاحدہ بھی۔ دوسری دفعہ جو مدح کی ہے وہ نہ صرف تفصیلی ہے بلکہ یہاں شاہ معظم
نے بڑا زور قلم صرف کیا ہے۔ اس کے برخلاف گلزارِ چشت میں دوسرے صحابہ کے
ساتھ ایک شعر پر اکتفا کیا ہے :

چوتھے... علی شاہ دلدل سوار + کتے ہیں جسے صاحبِ ذوالفقار
شجرۃ الاتقیاء میں شاہ معظم نے لکھا ہے کہ خدا نے نبی کو اپنا نائب بنایا اور نبی نے

علی کو اور علی نے ہر ملک میں اولیا کو اپنا نائب مقرر کیا۔ یہی بات زیرِ نظر رسالے میں بھی
کم و بیش انھیں الفاظ میں دہرائی ہے۔ چنانچہ حضرت علی کی مدح کے بعد نہایت اختصار
کے ساتھ کہتے ہیں :

نبی پر کرم کر نبوت دیا + علی کے حوالے ولایت کیا
علی کے ہیں نائب ہر اک شہر میں + ہر اک ملک میں ہو ہر اک دہر میں
ہر ایک (ملک) میں ایک اصحاب ہیں + ہر ایک دہر میں قطب اقطاب ہیں
علی نے ملک سب ولیاں کو دیے + ہر ایک ملک کو ایک والی کیے
غرض شاہ معظم نے حمد، نعت، منقبت اور تمہید سب کچھ (۳۷) آیات میں
ختم کر دی ہے، اور اس کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا ذکر شروع کیا ہے :
دیے ملک خواجہ کو یہ ہند کا + جتا ہند کا اور جتا سند کا ملہ
کتے کوچ ہند ولی شاہ کو + عطا ہے لقب شہ کو درگاہ سو
دیانت حق شہ کو اجیر کا + ہے جس کے نیچے ملک سیمیر کا
معظم کہتے ہیں کہ اجیر بد پر تھوی راج کی حکومت تھی۔ اس کا بڑا بھائی اچھے پال ملہ
بہت بڑا ساحر تھا۔ اچھے پال نے حضرت خواجہ پر سحر و طلسم کے کئی وار کیے، لیکن

لے تذکرہ کا بیان ہے کہ حضرت عثمان ہارونی سے خلافت و اجازت حاصل کرنے کے بعد
حضرت خواجہ معین الدین ہارون سے مدینہ منورہ مدعا ہوئے اور بارگاہِ نبوی پر حاضری
دی۔ اس موقع پر رسول اکرمؐ نے بشارت دی کہ "خدا نے ہندوستان کا ملک تیرے
سپر کیا ہے۔"

لے تذکرہ نگاروں نے اس کا نام بچے پال جوگی لکھا ہے۔ وہ راے پتھولا کا گرد اور بہت
بڑا ساحر تھا۔ راے کے حکم سے اس نے اپنے ڈیڑھ ہزار چیلوں کے ساتھ حضرت
کو تنگ کرنا شروع کیا، لیکن اس کے سحر و طلسم کی ایک نہ چلی۔ (تفصیل کے لیے
لاحظہ ہو، بڑی سوانح عمری صفحہ ۱۸)

اس کا ہر وار خالی گیا۔ اس رسوائی کی وجہ سے وہ چاہتا تھا کہ اڑکھنڈ کے پار نکل جائے، لیکن حضرت کی جوتیوں نے ہوا میں پرواز کی اور اس کو گھیر کر زمین پر لے آئیں۔ خواجہ اجیری کی اس کرامت کے بیان کے بعد صرف دو شعر مدح کے کہے ہیں :

مکمل ولی آج خواجہ ہے او : دنیا دین کا دیکھ راجا ہے او
پرستش کریں جن و انسان مل : دو عالم دیکھو شبہ سوں باندھے ہیں دل
اس کے بعد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی مدح لکھی ہے :

سچا قطب یو قطب اقطاب ہے : دنیا دین میں سچ یو ہمتاب ہے
قطب دین تو نام ہے شاہ کا : اقبال دے مکھ او پر ماہ کا
دلی شہر میں قطب اظہر ہوا : ہندستان تب سوں منور ہوا
عجب نور تھا مکھ او پر ذات کا : دسے چاند جون چودھویں رات کا
دیکھو شبہ کو خواجہ (نے) خواجہ کیے : دو عالم میں دیکھلا او جالا کیے
مرید دیکھ حق جس کو ایسا دیا : کتے زاہدان میں اُسے انبیا

حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر کے بارے میں معظم کہتے ہیں کہ انھوں نے طلب حق میں مختلف دیار و امصار چھان ڈالے، لیکن انھیں اصلی نعمت حضرت خواجہ قطب الدین

نے اس ناکافی اور نامرادھی نے جے پال کی آنکھیں کھول دیں اور وہ حضرت خواجہ کے دائرہ ارادت میں شامل ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ جے پال نے حضرت سے التفات کیا کہ مجھ کو عمر جاوید عطا کی جائے تاکہ سلاقی نامنی ہو سکے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ تو قیامت تک زندہ رہے گا، مگر چشم خلافت سے پوشیدہ رہے گا، چنانچہ مشہور ہے کہ جے پال اب تک زندہ ہے اور ہر شب مجھ کو زیارت روضہ مقدسہ کے لیے حاضر ہوتا ہے، جو زائرین ایسا سہ جھٹک جاتے ہیں ان کو راہ بتانے کی خدمت اس کے ذمے ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت نے جے پال کا نام عبداللہ رکھا تھا۔

(بڑی سوانح عمری صفحہ ۲۰)

کی خدمت میں حاصل ہوئی۔ حضرت فرید نے بھوک پیاس کی ہر داک کیے بغیر تلاش حق میں جو دشت فوری کی تھی اس کا اجر انھیں یہ ملا کہ مٹی ان کے لیے شکر بن گئی۔

کیے سیر سب پر اور بحر کا : ہر ایک ملک کا اور ہر ایک شہر کا
زدیکھے خدا کو بیابان میں : یہاں آکے دیکھے ہیں اک آن میں
کنک دیں لگ شیخ جنگل پھرے : مطالب یہاں آکے حاصل کئے
بھوکے رہ کے جنگل پھرے سواجر : شکر کر لیے شیخ مانی بھینتر

شاہ معظم کا بیان ہے کہ شیخ فرید کی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار اُن کی والدہ تھیں۔ انھوں نے اپنے لڑکے کی تربیت کچھ اس دھنگ سے کی کہ یہ لڑکا سمجھوں کے لیے شیخ ہو گیا۔ شیخ فرید نے چاروں راستے طے کیے تھے، تبھی وہ اصل حق ہوئے۔

اول والدہ شہ کی راشد ہوئے : دیکھو شیخ تب سب کے مرشد ہوئے
دیکھو چارہ پر سوجب آئے ہیں : وصل حق سوں تب شیخ نے پائے ہیں

معظم، حضرت نظام الدین اولیا کی مدح کرتے ہوئے دو باتوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ایک ان کا نگرخانہ، جس میں ہر روز ہزاروں آدمی کھانا کھاتے تھے۔

دوسرے ان کی مغل سماع۔ کہتے ہیں کہ اُن کی بارگاہ میں ہزاروں قوال اور سازندے جمع تھے اور حضرت صبح و شام ساز و سرود میں مستغرق رہتے تھے۔ معظم کا یہ بیان کچھ تو مبالغہ آمیز بیانات اور روایات پر اخیر کسی تحقیق کے اعتبار کر لینے کا نتیجہ ہے اور کچھ تو

لے صاحب سیر الاولیاء نے لکھا ہے کہ شیخ فرید نے طے کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ چھٹے دن ضعف اس قدر غالب آیا کہ آپ ٹھہراں ہو گئے۔ اگرچہ افطار کا وقت ہو گیا تھا، لیکن غیب سے کچھ نہ پہنچا، رات گئے بھوک سے بے تاب ہو کر حضرت نے چند کنکریاں زمین سے اٹھا کر منہ میں ڈال لیں، یہ کنکریاں شکر کی ڈالیاں بن گئیں، تبھی سے وہ پیر شکر بار اور گنج شکر کہلانے لگے۔ (سیر الاولیاء، صفحہ ۴۴)

اہل طریقت کے اس غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ وجد و حال، سوز و مستی اور جذب و بے خودی پابندی شریعت سے اونچی حالت ہے۔ اس لیے کہ یہ محو و سکر معرفت الہی کا نتیجہ ہوتا ہے، جس کو معرفت نصیب ہوا اس کے لیے شریعت ایک ادنیٰ چیز ہے۔ مغلوب الحال ہونا انسان کی مجبوری اور معذوری ہے، جس سے تکلیف شرعی ساقط ہو جاتی ہے، لیکن اس سے مغلوبیت کی حالت شریعت سے بہتر کیوں کر ہو سکتی ہے اور پھر صوفیہ پر غلبہ حال عموماً جنون دوری کا حکم رکھتا ہے، جس کا جنون دوری جنون قائم بن جاتا ہے، اُس کو مجذب کہتے ہیں اور مجذب کا حال اپنی جگہ جیسا کچھ ہو، وہ منصب رشد و ہدایت کے لائق نہیں ہوتا۔ حضرت نظام الدین اولیاء جیسے صاحب رشد، مرجع خلق اور باوی دین کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ رات دن ساز و فہم کے کیف سے مست حیلے خود رہتے تھے، نری غلط بیانی ہی نہیں بلکہ ان کے منصب ہدایت پر اتہام ہے۔ بلکہ اس کے آگے معظلم کہتے ہیں کہ نظام الدین اولیاء مجالس سماع میں حاضرین کو شراب معرفت پلاتے تھے، جس کسی کو یہ شراب میسر آتی وہ کامل اور واصل ہو جاتا،

یوسف اسٹینشاہ کا عام تھا * فراواں کلک جنس کا طعام تھا
تصرف اتھا شاہ کا بے شمار * کلا دنت تھے شاہ (کنے) کئی ہزار
بجنتر کتے شاہ کے قوال تھے * وہ قوال خود مست احوال تھے
کبھی گائیں جب وہ حسینی مقام * مجالس کو تب حال آوے تمام

۱۔ صاحب سیر الاولیاء نے حضرت نظام الدین اولیاء کی سماع سے دل چسپی، سماع کی مغفلوں، اس کے حجاز، آداب اور اہمیت کے بارے میں بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء سماع کو اہمیت منورہ دیتے تھے، لیکن صبح و شام اسی میں مستغرق نہیں رہتے تھے۔ ملاحظہ ہو،
(سیرۃ الاولیاء، نواں باب، صفحہ ۲۸۹)

کبھی شوق میں آجیاویں رباب * نہ رہتا اتھا کچھ بھی عالم میں تاب
کبھیں مست ہو چنگ بازی کریں * او عشاق کی کار سازی کریں
اکابر مجالس میں راتے رہیں * سدا ہے بحث سو ماتے رہیں
اتھا شاہ کا ہاتھ جم کا وہ جام * پیاسو ہوا ہے وہ تحصیل تام
پیاسو دیکھو قوح فاضل ہوا * وہ کامل ہوا اور واصل ہوا

حضرت نظام الدین اولیاء کی مدح کے بعد کہتے ہیں کہ ایک روز حضرت کو حکم ہوا کہ خواجہ منتجب الدین کو ملک دکن پر مقرر کریں۔ حضرت نے تعمیل حکم میں ان کو کئی اولمیا اور اتقیا کے ساتھ دکن کی طرف روانہ کیا۔ خواجہ منتجب الدین کئی منازل طے کرنے کے بعد یلوری کے مقام پر پہنچے تو فجر کا وقت تھا۔ انھوں نے اذان دی اذان کی آواز کے کان میں پڑتے ہی اس قطعے کے پسے والے تمام کا فر پتھر ہو گئے۔ معظلم کہتے ہیں کہ جس کسی کو ہمارے اس بیان پر شبہ ہو وہ یلوری جا کر ان پتھروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور ہمارے بیان کی تصدیق کرے۔

غار جائے الیورا کے بارے میں دکن میں یہ روایت آج بھی مشہور ہے کہ یہ اُس آبادی کا ایک حصہ ہے جو حضرت منتجب الدین کی بددعا سے پتھر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ بزرگان دین کے تذکرے اس قسم کی من گھڑت روایتوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس طرح کی بے سرو پاروایتوں پر معظلم کے اس درجہ یقین کو اُن کے حسن ظن اور جوش عقیدت کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے۔

۱۔ بعض تذکرہ نگاروں نے (مثلاً معارج الولاہیت) آپ کو شیخ العالم خواجہ فرید الدین گنج شکر کا مرید اور خلیفہ بتایا ہے، محبوب ذوالحسن، صفحہ ۸۱۹، برکات الاولیاء، صفحہ ۱۱

۲۔ الیورا

۳۔ صاحب برکات الاولیاء نے بھی اس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے (برکات الاولیاء، صفحہ ۱۲)

کنک ملک طے کر کے یاں آئے جب : اھر پیر کا سب بجالائے تب
ولایت کی تشریف سب پائے تھے : اسی کچھ قوت سویاں آئے تھے
فجر کا دیے بانگ شہ نے پکار : نبی کے کیے دین کو آشکار
ہوا بانگ کا ملک میں سب نشر : ندا سن کے کافر بے سب پتھر
یلوری میں جا کوئی نظار اکریں : ہمارا سخن وچ باور دھریں
شاہ معظم ایک اور روایت یہ بیان کرتے ہیں کہ بارگاہ ایزدی سے منتخب الدین کے
لیے روزانہ زرین اور جواہر نگار خلعتوں کے طبق اترا کرتے تھے۔ حضرت یہ طبق پہلے اپنے
سر پر رکھتے، پھر اس طبق میں سے لباسِ فاخرہ نکال کر زیب تن کرتے اور دوسرے
دن فقر میں تقسیم کر دیتے۔ اسی بخشش کی وجہ سے ان کا نام زر زری بخش مشہور ہو گیا
تھا۔

سدا حق سوں خلعت اترتا تھا : سدا پیار حق ان پہ دھرتا تھا
اترائے ہر روز درگاہ سوں : سدا فوہ فو خلعتاں شاہ کون
اترا آئے کسوت سدا زر زری : اموں رتن ہے بدل جوہری
طبق لے کے اوشاہ سر پر دھریں : اپیں مین کر شاہ بخشش کریں
اسی سلسلے میں حضرت کی یہ کرامت بھی بیان کی ہے کہ ایک مقامی راجا کی لڑکی کو،

جو بہت خوب صورت تھی، حضرت کے دیدار کا شوق پیدا ہوا اور وہ اپنی سہیلیوں کے
ساتھ گھر سے چل کھڑی ہوئی۔ حضرت کی بارگاہ میں پہنچی تو ان کے جاہ و جلال کو دیکھ کر رنگ
رہ گئی۔ قریب ہی ایک خشک باولی تھی۔ راج کمار کی کے دل میں وسوسہ آیا کہ اگر حضرت

لے مترجم روضۃ الاولیاء المعروف بہ نفحات الاصفیاء نے اپنے ذخیرہ قلمی کے حوائے سے لکھا
ہے کہ یہ خطاب حضرت نظام الدین اولیا کا عطا کیا ہوا ہے وروضۃ الاولیاء صفحہ ۵۲۔
معظم کی روایت تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ برکات، محبوبہ ذی المنن اور تاریخ فرشتہ میں بھی ملتی ہے۔

صاحب کرامت ہیں تو اس اندھی باولی کو پانی سے بھر دیں۔ راج کمار کی کے اس خطرے
کا حضرت کو القا ہو گیا اور انھوں نے باولی پر نظر ڈالی۔ پس کیا تھا باولی سے سیال سونا
اُبلنے لگا۔ یہ معظم کہتے ہیں کہ آج بھی جو لوگ حضرت کے عرس میں جاتے ہیں اس باولی
کو ضرور دیکھتے ہیں جو ستا بائیں (سونے کی باولی) کہلاتی ہے۔

کتے بائیں اول سوغالی اتھی : نہ تھا اُس میں پانی کتے اک رقی
رکھی دل میں یو بائیں پانی بھرے : کہوں گی بڑے پیر ہیں یو کھرے
اتھا کشف شاہ کو علام الغیوب : عنایت اتھا سب کشف القلوب
دیکھے بائیں پر شہ نے بھر کر نظر : اہل کر چلی بائیں سستے سے بھر
عرس کے بدل خلق آتی جتی : ہنوز لگ اسے ستا بائیں کتی
کچھ مدت بعد منتخب الدین کو القا ہوا کہ ان کا وقت موعود آن پہنچا۔ آپ نے شاہ
برہان الدین غریب کو بلا کر اس کی اطلاع دی اور فرمایا کہ اب تم دکن پر حکومت کرو۔
حضرت علی کا علم ان کے حوالے کیا اور جتنے مرید فقرا اور اولیا ساتھ تھے، ان سب کو
شاہ برہان کے ہم راہ کر دیا۔ راستے میں کئی اولیا اس قافلے کے ساتھ ہو لیے۔
معظم کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے منتخب الدین کے ہم راہ برہان الدین غریب
بھی آئے تھے، لیکن کسی تذکرے سے اس کی توثیق نہیں ہوتی۔ بعض تذکرہ نگاروں کا بیان

لے روضۃ الاولیاء نے بھی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ یہ روایت بیان کی ہے، اور لکھا ہے کہ
حضرت کی اس کرامت سے متاثر ہو کر سونا بائی نے اسلام قبول کیا اور اپنے پیر کی
نظر کی کیا اثر سے تھوڑے ہی عرصے میں بڑی عارفہ اور کاملہ ہو گئیں۔ سونا بائی کا مزار
حضرت کے گنبد کے برابر چنبلی کے درخت کے نیچے زیارت گاہ خلافت ہے۔ ملاحظہ ہو
(ترجمہ روضۃ الاولیاء، صفحہ ۵۲)

لے روضۃ الاولیاء، بہ حوالہ محبوب ذی المنن، صفحہ ۱۵۲

ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا نے مولانا برہان الدین غریب کو اپنے سات سو میدوں کے ساتھ جن میں بعض پانکی نشین تھے، دکن روانہ کیا تھا اور بعضوں نے لکھا ہے کہ پہلے حضرت منتخب الدین زیر زری بخش کو بھیجا اور جب دیوگیر میں ان کا انتقال ہوا تو حضرت برہان الدین غریب کو خرقہ خلافت عطا کر کے دکن کی ولایت پر مامور کیا۔ یہ واقعہ حضرت نظام الدین اولیا کے انتقال سے کچھ ہی پہلے کا ہے۔

بہر حال معظم کے بیان کے مطابق حضرت برہان الدین غریب چودہ سو اولیا کامل کے ساتھ لیوڑا سے دولت آباد روانہ ہوئے۔ راستے میں خلق خدا انھیں دیکھ کر ان کی معتقد ہوتی گئی۔ دولت آباد پہنچ کر حضرت نے خود تو وہیں سکونت اختیار کی، لیکن اپنے ساتھیوں کو رشد و ہدایت کے لیے مختلف مقامات کو روانہ کیا،

براہر جتے اولیا سات تھے : نفی ذات میں ہو کر اثبات تھے دیے ملک سب باٹ کر شاہ نے : سو اس شاہ برہان جم جاہ نے شہنشاہ کے دیک سارے فقیر : ہراک ٹھار بیٹھے میں سب ہو کے پیر معظم حضرت برہان کے کمالات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھیں سماع کا بہت شوق تھا اور اس تعلق سے تقریباً وہی بات کہی ہے جو نظام الدین اولیا کے بارے میں کہ آئے ہیں:

بجز راگ دیگر نہ کچ کام تھا : سدا سے محبت کیرا جام تھا

۱۔ تاریخ فرشتہ، جلد دوم، صفحہ ۵۲۱

۲۔ واضح رہے کہ لیوڑا سے دولت آباد چار پانچ کوس سے زیادہ فاصلے پر واقع نہیں ہے۔

۳۔ صاحب سیر الاولیا کا بیان ہے کہ مولانا برہان الدین کو سماع میں پلے در پلے کا غلو تھا اور آپ کے ساتھ آپ کے یاروں کے دھن میں ایک جدا گانہ طرز تھی، چنانچہ آپ کے یاروں کو اور لوگ برہانی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ (سیر الاولیا، صفحہ ۲۷۹)

حضرت برہان الدین غریب کے بعد شاہ راجو قتال، حسن سبحی، شاہ زین الدین پیر تین و مڑی، شاہ خوند میر، شاہ کالے، شاہ حسین گنج رواں شاہ ساگر ٹسے سلطان، کے علاوہ اور کئی بزرگوں کا ذکر کیا ہے۔ تعجب ہے کہ خانوادہ چشت کے اس تذکرے میں شاہ حسین گنج رواں اور شاہ ساگر ٹسے سلطان کا تو ذکر ہے جو علی الترتیب سہروردی اور رفاعی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ سلسلہ چشت کی وہ ایک اہم کڑی میں اور بندہ نواز کے توسط سے انھیں کا فیض دکن میں عام ہوا ہے۔

شنوی کے آخری حصے میں معظم نے اورنگ زیب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے شاہ برہان الدین غریب کی گنبد میں پناہ لی تھی تاکہ حضرت کی برکت سے گناہ بخشے جائیں،

دیکھو بادشاہ یہ ہندوستان کا : سو اس باغ بہتاں گلستان کا کتنے نام اس کا ہے اورنگ زیب : او مقبول حق کا ہے بے شک ریب یاشہ کی گنبد کا آکر پناہ : برکت سوں حق شہ کے بخشے گناہ ابونصر خالدی صاحب نے ان اشعار سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ :

”یعنی محی الدین اورنگ زیب عالم گیر نے شہ کی گنبد کا پناہ لیا۔ مراد یہ ہے کہ اس کی لاش برہان الدین غریب کی درگاہ کے احاطے میں دفن ہے۔“

اورنگ زیب شاہ زین الدین کے روضے کے پائین دفن ہیں اس لیے خالدی صاحب

۱۔ روضۃ الاولیا، المعروف بہ نفحات الاصفیہ، صفحہ ۱۲۰

۲۔ تاریخ قندھار، صفحہ ۲۰۸

۳۔ قدیم اردو، جلد اول، صفحہ ۲۲۳

۴۔ گنبد اطہر (حضرت زین الدین) کے جانب غریب سلطان اورنگ زیب غازی نور اللہ مرقدہ۔ حسب وصیت اپنے مولانا کے ظل عافیت میں آسودہ ہیں۔ روضۃ الاولیا المعروف بہ نفحات الاصفیہ، صفحہ ۱۲۷

کی تاویل درست نہیں معلوم ہوتی۔ پھر معظم کے شعر میں گنبد اور پناہ کے لفظ بھی غور طلب ہیں۔
 دکن میں اب بھی نیر روایت مشہور ہے کہ صوفی سرمد کی شہادت کے بعد اورنگ زیب
 کا سکون قلب جاتا رہا تھا اور راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے بھی آنکھ
 لگتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ کسی نے چار پائی الٹ دی ہے۔ برسوں وہ خواب شیریں کی
 نعمت سے محروم رہے، یہاں تک کہ حضرت برہان الدین غریب کی درگاہ پر فاتح خوانی
 کے لیے حاضر ہوئے۔ روضہ مبارک میں قدم رکھتے ہی انھیں ایسا محسوس ہوا کہ اُن کا کھویا
 ہوا سکون مل گیا اور انھیں نیند آگئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معظم نے تذکرہ بالا شعر میں
 اسی روایت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مثنوی کو ختم کرتے ہوئے معظم کہتے ہیں کہ سالک کو چاہیے کہ شیخ، رسول اور
 اللہ کو ایک سمجھے اور خود اپنا اور اپنے پیروں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :
 معظم کہتے قادی ہے فقیر : گناہ گار، عاجز، فقیر و حقیر
 ملاجھ کو مرشد ہوا میں امین : مرے حق پورا شد ہو آپیں امین
 یہاں آکے طالب ہو سجدہ کیا : مجھے پیر نے حق دکھا کر دیا
 مثنوی مناجات پر ختم ہوتی ہے :

مناجات یارب یو کرنا قبول : بحق محمد آل رسول
 معظم کی یہ مثنوی بھی شجرۃ الاتقیاء کی طرح خاصی طویل ہے، لیکن شجرۃ الاتقیاء کی گہنی گفتار
 اس میں نہیں ہے، اگرچہ بزرگان سلسلہ کے کمالات و کرامات کے ذکر میں زور بیان دکھانے
 کی بڑی کوشش کی ہے، لیکن غلوں کی وہ شدت اور عقیدت کا وہ جوش نہیں ہے، جو
 شجرۃ الاتقیاء میں نظر آتا ہے۔ اس لیے ادبی اعتبار سے بھی یہ مثنوی شجرۃ الاتقیاء سے بہت
 پست ہے، اگرچہ شجرۃ الاتقیاء میں بھی بہت سی ایسی روایتیں بیان کی ہیں جو حقائق کے خلاف
 ہیں، لیکن زیر نظر تبصرہ مثنوی میں اس قسم کی روایتوں کی کثرت ہے، جس کی وجہ سے تذکرے
 کے اعتبار سے بھی اس کا وزن گھٹ جاتا ہے۔

شجرۃ الاتقیاء

شاہ معظم کی منظومات کے نسخے مختلف کتب خانوں اور خانگی ذخیروں میں مل
 جاتے ہیں، لیکن شجرۃ الاتقیاء کے صرف ایک ہی نسخے کا پتا چل سکا ہے، جو کتب خانہ
 نواب سالار جنگ (مخطوط نمبر ۱۳۱ تصوف) میں انھیں کی ایک دوسری مثنوی گلزار
 چشتیہ کے ساتھ جملد ہے۔ یہ نسخہ چھاپیس صفحات اور (۴۸۶) اشعار پر مشتمل ہے۔
 مولوی ہاشمی مرحوم کتب خانہ نواب سالار جنگ کے اس نسخے کو متعارف کرانے
 سے بہت پہلے اس مثنوی کے ایک اور نسخے کا دکن میں اردو میں ذکر کر چکے تھے، جو
 انھوں نے کسی کتب فروش کے ہاں دیکھا تھا۔ اس نسخے کا پتا نہ چل سکا۔ ہاشمی صاحب
 نے اس نسخے سے جو نمونہ دیا ہے، اُس میں صرف ابتدائی دو شعر شجرۃ الاتقیاء کے ہیں اور
 باقی آٹھ شعر مفتاح الاسرار کے ہیں۔

معلم کا بیان ہے کہ اُس نے اس مثنوی کے پانچ سو ابیات کہے ہیں :

۱۔ مولوی ہاشمی مرحوم نے اس مثنوی کا نام گلزارِ جنت لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو نواب سالار جنگ مرحوم
 کے کتب خانے کی قلمی کتابوں کی وضاحتی فهرست، صفحہ ۷۸۵
 ۲۔ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، چوتھی اشاعت، صفحہ ۲۱۲
 ۳۔ اس کے اسباب کے لیے مفتاح الاسرار کے نسخوں کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

اتنا پانچ سو بیت بولا ہوں میں ۛ جو بولو کہے سو چکھو لاہوں میں
لیکن کتب خانہ نواب سالار جنگ کے نسخے میں صرف (۴۸۶) آیات ہیں۔

شاہ معظم نے اس مثنوی کے موضوع اور شان نزول کے بارے میں لکھا ہے:
امر مجھ ہوا خواب میں کائنات ۛ تو اظہار کر گنج مخفی کی بات
عبادت میں حق کی تو مشغول ہو ۛ کہدورت یہ دنیا کی سب دل سول دھو
صفت کر نبی کا دل و جان سوں ۛ معزز اُسے جان ایمان سوں
اول پانچ تن کا ثنا بول کر ۛ مراتب ان کا تو کہ کھول کر
نبوت، ولایت کی کہ بات تو ۛ اتنا اٹھ قلم لے ایس ہاتھ تو
نبی کے امر پر یو بولا ہوں میں ۛ چھپے راز کو تو چہ کھولا ہوں میں
اور مثنوی کا نام بھی رسول کریم کے حکم کے مطابق شجرۃ الاتقیاء رکھا:

ہوا مجھ امر خاتم الانبیا ۛ اسے نام رکھ شجرۃ الاتقیاء
معظم کے بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مثنوی کا موضوع تصوف و معرفت ہے۔
مولوی نصیر الدین ہاشمی کو بھی یہی غلط فہمی ہوئی ہے اور انھوں نے لکھا ہے:
اول الذکر دونوں مثنویاں (شجرۃ الاتقیاء اور آزاد نامہ) تصوف میں ہیں۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر یہ حضرت بندہ نواز کے اس سلسلہ فیض کا تذکرہ ہے، جو
حضرت جمال الدین مغربی کے توسط سے شاہ معظم کی زندگی میں علی پیر تک پہنچا تھا شاہ معظم
نے اس سلسلے کے تمام بزرگوں کا ذکر ترتیب وار کیا ہے اور ان کے مختصر اور اہم حالات
زندگی اور کرامات بیان کرتے ہوئے، اُن میں سے ہر ایک کی معرفت و ولایت اور محاسن
و کمالات کی تعریف و توصیف کی ہے۔ احوال و کوائف ہی کے ضمن میں تصوف کے نکات
بھی بیان کیے ہیں۔ اس طرح یہ رسالہ خانوادہ چشت کی بیجا پوری شاخ کا منظوم تذکرہ بھی ہے

اور موضوع کے اعتبار سے منقبت بھی۔ موضوع کی اس مناسبت کے اعتبار سے اس
مثنوی کا نام شجرۃ الاتقیاء موزوں، جامع اور چسپیدہ نام ہے۔

مثنوی کا آغاز حمد سے ہوتا ہے، جس کے بعد نعت رسول اور منقبت صحابہ ہے۔ حمد
میں مضامین کی نوعیت اور بیان کا اسلوب کم و بیش وہی ہے، جو مضامین الاسرار میں ملتا ہے:

الہی توں قادر ہے صاحب غنی ۛ تو رزاق مطلق ہے سمیر دہنی

ترا نام قادر سزاوار ہے ۛ تیرے نام کا سب کو ادھار ہے

اسم بامسمیٰ ہے تیرا حکیم ۛ سیع بصیر عظیم حکیم

توں حاکم ہے حکمت میں پورا دسا ۛ ترا نام نا کچھ ادھورا دسا

علم غیب کا سچ یو دھرتا ہے تو ۛ نئی حکمتیں تو چہ کرتا ہے تو

فلک بے ستوں تو معلق کیا ۛ ستاروں سے کیا خوب رونق دیا

لگاتس میں قندیل تو نور کی ۛ چراغاں لگا کر چندر سور کی

یو دن رات کیا خوب بنایا ہے تو ۛ یو خلعت عجبائے بنایا ہے تو

یو خورشید سوں روز روشن کیا ۛ رین کو توں چند سوں گلشن کیا

یو بستر زمیں کا بچھایا ہے تو ۛ دیکھا کر یو قدرت رب بچھایا ہے تو

یہرستا ہے باران زمیں کے اوپر ۛ تو ہوتا ہے دنیا میں الزال مگر

بچھاتا ہے اور سفرۂ خاص و عام ۛ کھلاتا ہے خلقت کو الوال طعام

پھراتا ہے دن رات گردشِ فلک ۛ بناتا ہے حکمت سوں جن و ملک

او کرتا ہے کیا بادشاہی عظیم ۛ دیکھاتا ہے حکمت اپنی وہ حکیم

(دکھاتا)

محیط ہے کتے سب میں موجود او ۛ ہے مطلق کتے دیک مجبود او

دہی دیک دریاے وحدت ہوا ۛ او وحدت کتے سہمی کثرت ہوا

ہر ایک روپ میں ایک مظہر ہے او ۛ ایس رہ دیکھانے کو رہبر ہے او
منکا حق ایس کو کروں آشکار ۛ نکل شوق سوں گنج مخفی سے بھار
رسول کریم کی نعت کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہیں، صاحبِ فرقان
ہیں اور صاحبِ معراج ہیں؛

محمد عجب نام اپنا رکھا ۛ ایس کو چھپا اور رسول کر دیکھا
نبی کا اول نور انظار کر ۛ کیا سب اسی نور سوں بحر بر
نبی کے طفیلوں دیکھے کردگار ۛ دو عالم اوپر تو نیچے دھرتا ہے پیار
اولوالعزم اور ان کو مرسل کیا ۛ کرم کر کیا خاتم الانبیا
نبی کو سو نائب کیا اپنا ۛ نبی کو خلافت دیا آپنا
دیا پیار سو تاج لولاک کا ۛ عطا اُس کیا تخت افلاک کا
دیا حق نے اپنا حکومت اُسے ۛ جکچہ شان و شوکت سو قدرت اُسے
بلا کر، اُسے رب نے معراج کو ۛ دیا پیار سوں تخت اور تاج کو
یو خلقت کیا حق نبی کے بدل ۛ یو خلعت دیا حق نبی کے بدل

صحابہ کی منقبت کے بعد نبوت اور ولایت کے تقابلی صفات کے ذکر میں ہر شازدہ
صرف کیا ہے اور ان کے نازک فرق کو واضح کرنے کے سلسلے میں اپنی نکتہ رسی، دقت نظر
اور غیر معمولی بصیرت اور آگہی کا ثبوت دیا ہے؛

نبوت کی مسند نبی کو دیا ۛ ولایت علی کو عنایت کیا
نبوت ہے چشمہ سو آب حیات ۛ ولایت کے صدفے سوں آتا ہے ہات
نبوت سو خلقت میں جوں ہے شجر ۛ ولایت کتے اُس کو آیا ثمر
نبوت خزانہ یو امراز ہے ۛ ولایت طرف سو ہے انظار ہے
نبوت ولایت یو ہے یک دگر ۛ ولایت کتے ہیں نبی کا امر

نبوت مثالے کہ جیوں سور ہے ۛ ولایت سو اُس سور کا نور ہے
نبوت کا زیور ولایت سو ہے ۛ ولایت کو قوت نبوت سو ہے
نبوت ولایت کی یک ہے مزاج ۛ یو دو مل کے قدرت کو دیتے رواج
نبوت جواہر کی جیوں کھان ہے ۛ ولایت سو جوہر یو ایمان ہے
نبوت ولایت سوں سب کام ہے ۛ دیکھو تو ہی خلقت کو آرام ہے
نبوت اور ولایت کے موضوع پر انظار خیال کے بعد پھر ایک بار وہ حضرت علی کی
منقبت کی طرف رجوع کرتے ہیں؛

دیا حق اُسے سیف اور یہ قلم ۛ حوالے کیا دین کا اُس علم
علی پر کرم حق ازل سو کیا ۛ تو مہر ولایت علی کو دیا
علی کے کتے ہات سب کام ہے ۛ علی کیچہ قوت سوں اسلام ہے
علی کے کرم سو یو ہوتے ولی ۛ علی سوں کھو لاسب مخفی اور علی
علی کیچہ ہے ہات آب حیات ۛ علی کیچہ صدفے سوں آتا ہے ہات
شاہ معظم کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نیابت رسول کریم کو عطا کی اور حضرت علی
کو نبی کریم کا نائب مقرر کیا۔ دنیا میں جتنے اولیا ہوئے ہیں اور ہوں گے وہ سب نائب علی ہیں
اور انھیں سے ہر شہر، ہر ملک اور ہر زمانے میں بندگانِ خدا نے راہ معرفت پائی ہے؛

نبوت نبی کو دیا آشکار ۛ علی کے دیا ہات حق ذو الفقار
نیابت او اپنا نبی کو دیا ۛ نبی کو سو نائب علی کو کیا
علی کیچہ نائب میں سارے امیر ۛ جہاں لگ یو ہیں پیر اور سب فقیر
ہر یک شہر بیانے ہیں کئی اولیا ۛ ہر یک راہ دیکھانے کو ہیں اتقیا
ہر یک ملک میں دیک اصباح ہیں ۛ ہر یک ملک میں مطلب اقطاب ہیں
ہر یک ملک کو ایک والی کیا ۛ ہر یک باغ کو ایک مالی کیا

اسی وضع دکھن اوپر کر کرم : دیا بھیج والی اپیں کر رحم
یہ والی دکھن حضرت بندہ نواز گیسو نواز ہیں یعنی حضرت علی کا سلسلہ فیض حضرت
بندہ نواز کے توسط سے دکھن تک پہنچا ہے۔

یہیں سے اصل رسالہ شروع ہوتا ہے اور شاہ معظم حضرت بندہ نواز سے علی پیر تک
اس سلسلے کے بزرگان دین کے حالات سلسلہ وار بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

مثنوی کے اس ابتدائی حصے کے مضامین اور موضوعات کی ترتیب پر نظر ڈالنے کے
بعد جب ہم سبب تصنیف سے متعلق اشعار تک پہنچتے ہیں تو یہ شعر ایک سوالیہ نشان
بن کر سامنے آتا ہے۔

اول پانچ تن کا ثنا بول کر : مراتب انوں کا تو کہ کھول کر
اس لیے کہ شاہ معظم نے حمد اور نعمت کے بعد صحابہ کی منقبت کی ہے اور سبب تصنیف
کی وفات کے بعد نبوت اور ولایت کے مدارج و مقامات کی تشریح کرتے ہوئے پنجتن پاک
میں سے سرچشمہ فیض کی حیثیت سے صرف حضرت علی کی چھ ایک بار مدح سرائی کی ہے
اور پنجتن پاک کا اچھا سا ذکر کیا ہے۔

اول پانچ تن پاک پیدا کیا : انوں کے سبب سب ہویدا کیا
اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ اس رسالے میں عرف عام کے خلاف پانچ تن (پنجتن)
سے مراد رسول اکرم صلعم اور ان کے چار اصحاب ہوں گے اگرچہ شاہ معظم جیسے صاحبِ اہلیت
سے اس نئی تاویل کی توقع نہیں کی جاسکتی لیکن متذکرہ بالا پہلا شعر نعمت اور مدح صحابہ کے
بعد آیا ہے اس لیے اس قیاس کے لیے گنجائش مکمل آئی ہے اور چونکہ آگے پنجتن پاک
کے مراتب کھول کر بیان نہیں کیے ہیں اس لیے بھی اس قیاس کو مزید تقویت ہوتی ہے۔

حضرت بندہ نواز گیسو نواز کی مدح میں شعراے دکھن نے بڑے شاندار قصیدے
لکھے ہیں جن میں فکر و فن کا کمال دکھانے کے لیے بڑا زور لگایا ہے۔ معظم نے ان شعرا

کے برخلاف انتہائی سیدھے سادے انداز میں مدح کہی ہے۔ اس سادگی اور بے تکلفی
کی وجہ سے مدح میں بڑی دل کشی، جاذبیت اور تیکھا پن پیدا ہو گیا ہے اور مدوح کے جو
اوصاف اور کمالات بیان کیے گئے ہیں ان کے مبنی بر حقیقت ہونے کا وہ احساس پیدا
ہوتا ہے جس سے روایتی قصیدہ بالعموم محروم رہتا ہے :

مبارک عجب نام ہے شاہ باز : محمد حسینی ہیں گیسو دراز
اونیں خانوادہ ہے ایک چشت کا : دیا ہات حق اُس کی بھشت کا
وہی دیک دکھن کو حامی ہوا : وہی بادشاہ ایک نامی ہوا
اُمی کی برکت سوں آرام ہے : اُمی کے تصدق سے سب کام ہے
اُمی کے تصدق سو دکھن ہوا : لقب تب یہ دکھن سو دکھن ہوا
نوازا ہے مجھ سار کے کئی گدا : گدا کو نوازا کیا بادشاہ
یو برحق دیا سچ ہے بندہ نواز : کیا دیک دکھن کو سب سرفراز
دیکھو بات رویت کی کھولا تمام : کیا راز مکشوف سب خاص و عام
وہی بادشاہ سب سلاطین کا : دیا تخت حق اُس دنیا دین کا
مکمل ولی سچ ہے قطب الزماں : دیکھو سب ہے خلقت کو شہ کا اماں
حکومت ولایت سو کرتا ہے او : لیکن حمایت بھی دھرتا ہے او
دیکھو پل میں احمد کو شاہی دیا : سو ترلوک کی بادشاہی دیا
لقب اُس مسما یوشہر باز ہے : عرش سوبلند اُس کی پرواز ہے
نبی کا کتے لیچہ دل بند ہے : علی کا تو برحق او فرزند ہے
سمیحا کی تاثیر ہے بات میں : دیا حق نے قدرت یو سب باتیں
کیا بات مکشوف من عرف کا : دیا آشنائی نقد عرف کا
شہنشاہ نے دولت دیے آل کو : مریداں پہ کھولے چھپے راز کو

کتنے آل کو اپنی مسند دیے ۛ کرامت سکت سب عنایت کیے
مریدان دیکھو شہ کے قابل ہوئے ۛ ایکس سوں دیکھو ایک کامل ہوئے
حضرت بندہ نواز کے بعد جمال الدین مغربی، کمال الدین بیابانی، میراں جی شمس العشق
برہان الدین جانی، امین الدین علی اعلیٰ، بابا شاہ حسینی اور علی پیر کے حالات بیان کیے ہیں۔
جمال الدین مغربی، بندہ نواز کے دادا خسرو تھے، لیکن معظم نے یہ رشتہ نہیں بتایا
ہے بلکہ یہ لکھا ہے کہ وہ بندہ نواز کے پیش امام، عالم، فاضل اور صاحب کمال بزرگ
تھے۔

اتھے یک شہنشاہ کے پیش امام ۛ اتھا علم تحصیل اُن پر تمام
کتنے نام اُن کا اتھا شہ جمال ۛ اتھے مغربی اور صاحب کمال
مغربی علوم ظاہر میں کمال رکھتے تھے لیکن علوم باطن سے بہرہ ور نہ تھے۔ وہ ایک
دن بندہ نواز کی خدمت میں حاضر ہوئے، زمین کو بوسہ دیا اور التماس کی: آپ ایک
عالم کو اسرار و رموز سے آگاہ کرتے ہیں، مریدوں کو حق سے ملاتے ہیں اور رسول اکرم کے
فیض سے بہرہ ور کرتے ہیں۔ آپ ہی کے کرم سے دکن کی سرزمین گلشن بن گئی ہے۔ میں
ایک مدت سے آپ کی خدمت میں رہتا ہوں، آپ سے بڑی توقعات وابستہ ہیں، مجھ
پر بھی حق کے اسرار منکشف فرمائیے۔

بندہ نواز نے مغربی کی باتیں سننے کے بعد ارشاد فرمایا:

اول کفر اختیار کرنا یہاں ۛ اول پاؤں تل سیس دھرنا یہاں
اول زہد ایمان کرنا نذر ۛ کچھ پیار کا چیز دھرنا نذر

ۛ شاہ محمد علی سامانی، سیر محمدی، صفحہ ۲۵

ۛ صاحب سیر محمدی نے لکھا ہے کہ مولانا بہاء الدین دہلوی نے کئی برس تک امامت نواز
حضرت محمد مکی سے حوالا نا جمال الدین مغربی کا ذکر نہیں کیا ہے، سیر محمدی، صفحہ ۱۴۱۔

یو کسبی علم سب بسرنا کتنے ۛ کہا پیر کا دل میں دھرنا کتنے
ترک کر کے سب کفر اسلام کو ۛ ترک کر کے سب تن کے آرام کو
نفی توچہ ہونا اپنی پیسر میں ۛ سو جیوں بوند ہافم ہے بیک نیر میں
نبی میں نفی جاننا پیسر کو ۛ رسول کر کے توں ماننا پیسر کو
نبی کو نفی جاننا ذات میں ۛ بقا توچہ ہوتا ہے اثبات میں
شریعت، طریقت، حقیقت سرجل ۛ دیکھو معرفت میں ہے حق کا وصل
شریعت کی رہ میں ہے آرام لئے ۛ کتنے حق سوں پاتا ہے آرام لئے
طریقت سو عارف یو کامل ہوئے ۛ حقیقت سوں عاشق یو عامل ہوئے
سبحہ معرفت حق سوں واصل ہیں ایک ۛ درس عشق کا پڑھ کے فاضل ہیں ایک
یو معصوم پرستی سے سب کام ہے ۛ یو سب توچہ انعام اکرام ہے
یو طالب اور رکھول دیتے ہیں پیسر ۛ مرید توچہ ہوتا ہے روشن ضمیر
سکاتے ہیں باطن میں روزہ نماز ۛ مریدان پہ کھلتا ہے تب دل کا راز
جکوئی پیر پکڑا سو سلطان ہے ۛ جسے پیر نہیں اُس کو شیطان ہے
بجز راہ بر راہ پاتا نہیں ۛ بجز پیر کچھ بات آتا نہیں
سمجھتے ہیں سب بات کامل تھیں ۛ ہیں عالم تھیں اور عامل تھیں

ان ارشادات کے سننے کے بعد مغربی سرود کھڑے ہو گئے۔ سجدہ تحیت بجالایا اور
عزم کی کہ انھیں بیعت سے سرفراز کیا جائے۔ بندہ نواز نے خوشی کے ساتھ ان کی درخواست
قبول کی، مرید کیا، اسرار کی تعلیم دی اور تمام مراحل، منازل اور مدارج طے کرائے:
اول بات من عرف کی بول کر ۛ سو بعد از فقہ عرف سب کھول کر
کیے راز کشف یک بات میں ۛ دیے تیغ گنج کا رکلی بات میں

ۛ وجوہات خمسہ، واجب الوجود، ممکن الوجود، متعین الوجود، عارف الوجود، واحد الوجود

جبکہ بولنا تھا سو بولے تمام : چھپا راز سب اُن پر کھولے تمام
 مجالس میں لے جانی سوں ملا : ولایت کی تشریف اُن کو دلا
 رجا حق سوں یک پل میں داخل کیا : در عشق کا دے کے فاضل کیا
 اس کے بعد خلافت عطا کی گئی اور سفر اختیار کرنے کا حکم دیا۔

سفر کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں : ایک سفر ظاہری اور دوسرا باطن
 کا سفر، جس سے قرب ذات حاصل ہوتا ہے :

سفر ایک ظاہر تو پھرنا ہے یو : سو دُمر ا خدا سوں انپڑنا ہے یو
 اور ج بھی دو ہیں : ایک حج بیت اللہ اور دوسرے دل داری خلق اللہ پہلار ج اصغر ہے
 اور دوسرا حج اکبر :

دیکھو ایک ہے حج اصغر کتے : سو دُمر ا اُسے حج اکبر کتے
 سفر میں تصرف کرو پانچ گنج : کرو دور عالم کے سینے سوں رنج
 یو کعبہ بنایا ہے کہتے خلیل : سو دُمر ا یو کعبہ ہے رب الجلیل

۱۔ جہاں ناعلیٰ شاہ نے بحوالہ تہذیب الخوارق و تاریخ خورشید جاہی لکھا ہے کہ مولانا مغربی کو
 نصوص الحکم میں مہارت تھی۔ اس کتاب پر بہت اعتقاد رکھتے تھے۔ آپ مرد مسافر و حکیم جہاں
 تھے۔ شرح نصوص بڑی لطافت کے ساتھ لکھی تھی۔ حضرت بندگی مخدوم (بندہ فنان) فرماتے تھے
 کہ میں ایک سال اُن کے ساتھ رہا۔ کسی ایک مسئلہ پر نصوص کے بارے میں تکرار شروع ہوئی،
 چھ مہینے تک مباحثہ جاری رہا۔ آخر کار مولانا نے حوصوف نے بندگی مخدوم کے ہاتھ پر بیعت
 کی اور درجہ کمال پر فائز ہو گئے۔ (تاریخ محریہ، صفحہ ۲۰۰)

۲۔ سعدی نے بھی یہی کہا ہے ۔

دل بدست آوردن حج اکبر است
 از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

سفر تبلیغ و تلقین، رشد و ہدایت اور دل داری و دل سوزی کا حکم دینے کے بعد بندہ فنان
 نے بشارت دی کہ اس سفر میں تم سے شاہ کمال ملیں گے اور اُن سے تمہارا سلسلہ فیض
 پھلے پھولے گا، اور دعا فرمائی :

تمہارا دعا حق اجابت کرے : تمہاری امر بیل منڈوے چڑھے
 اسی ضمن میں منظم نے خواجہ بندہ نواز کی زبان سے اپنے دادا پیر حضرت امین کا سلوک
 بیان کیا ہے، لیکن یہ محض اچھتے سے اشارے میں اور اُن میں ربط و تسلسل بھی نہیں ہے، جس
 کی وجہ سے پوریاں الجھ کر رہ گیا ہے اور اُس قاری کے لیے جو سلوک برہانی اور حضرت امین
 کے اجتہاد سے واقف نہیں یہ اشعار چیتاں معلوم ہوتے ہیں :

کتے جہد اکبر ہے اس پاٹ میں : بڑا کچھ خطر ہے جنگل گھاٹ میں
 سو اس راہ میں ناچ سونا کتے : یو قوشہ عمر ناچ کھونا کتے
 کتے راہ میں چار منزل ہے دیک : اترتے ہیں اس تھار راحل ہیں دیک
 کتے عاشقاں راہ بھی چار ہیں : ہر یک راہ میں لیچہ اغیار ہیں
 سید سے بات کا راہ کیا خوب ہے : جو اس راہ سوں آتا محبوب ہے :
 موزی پانچ ہیں راہ میں لئی کیل : اول اُن کو کرنا کتے ہیں قتل
 امارہ بڑا دیو ہے راہ میں : اوسے مار سٹنا کتے چاہ میں
 ہوا خنس یو پانچ ہیں راہ تمھیں : کتے دور کرنا جلا کر وطن

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ جو راقم الحروف کی کتاب : سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ، حیات اودکارنا،
 صفحہ ۱۶۰-۲۱۳۔

۲۔ پہلے راہ اور پھر منزل کا ذکر ہونا چاہیے۔ اول مقام، بعدہ راہ، بعدہ منزل (کلمۃ الحقائق) یہی بے نتیجی
 آئے اشعار نما بھی بنتی ہے
 ۳۔ حواصن خمسہ

اول سات مستیاں کو دینا ترک ۛ کتے ایک مستی سو رہنا مرگ
 اول چار تن سو گزرنا کتے ۛ شہادت پر تو حق سو پانا کتے
 حیاتِ حق سے مر کے جینا اول ۛ کتے توجہ پاتے ہیں حق کا وصل
 یو راہ شش جہت کا کتے چھوڑ کر ۛ چلو لامکاں پر نظر جوڑ کر
 پوچھے تھار پڑتے ہیں غفلت کتے ۛ جو سویا سوکھو یا ہے دولت کتے
 تھارے نزد جو ہراں پانچ ہیں ۛ وہ چوری سے اپنے ور زور ہیں
 اول اپنی توحید حق بوجھ کر ۛ شفاعت کرے گا قدر بوجھ کر
 تھارے کتے دم ہیں بارہ ہزار ۛ کتے یاد میں حق کے کرنا شمار

منظم ان آیات میں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، اس کو مربوط انداز میں اختصار کے ساتھ
 یوں کہا جا سکتا ہے کہ راہِ سلوک میں سالک کو چوکس رہنا چاہیے، اس لیے کہ اس راہ میں بڑے
 نشیب و فراز آتے ہیں اور بہت نئے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سفر میں چار راہیں
 اور چار منزلیں آتی ہیں۔ ان سے گزرنے کے بعد شہادتِ شہداء حاصل ہوتی ہے اور سالک
 کو قربِ حق نصیب ہوتا ہے۔ اس احوال کی تفصیل یہ ہے کہ مراتب وجود چار ہیں: واجب الوجود
 ممکن الوجود، متنع الوجود اور عارف الوجود۔ ان کی چار راہیں ہیں: شریعت، طریقت،
 حقیقت، معرفت، چار منزلیں ہیں: ناسوت، ملکوت، جبروت، لاہوت، اور چار
 شہادتیں ہیں: شہادتِ مبداء، شہادتِ وحداء، شہادتِ عمدا اور شہادتِ شہداء۔

لے مَوْتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوتُوا۔ یہاں مرگ ظاہری مراد نہیں بلکہ مرگِ ارادی ہے۔

لے منظم نے وجوداتِ خمسہ (پانچ تن) میں سے صرف چار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پانچواں وجود،
 واحد الوجود، یہ حق سبحانہ تعالیٰ کا وجود ہے۔ اسی سے عارف الوجود، متنع الوجود، ممکن الوجود،
 اور واجب الوجود ظاہر ہوئے ہیں۔

سلوک کا آغاز مقامِ شیطانی سے ہوتا ہے۔ اہم مقامِ شیطانی کفر، شرک، نافرائی
 جہاد و ہوس، بغض و حسد اور نفسانیت سے عبارت ہے اور ان کا سرچشمہ نفسِ امارہ ہے
 نفسِ امارہ کا محلِ قلبِ مضغہ اور اس کے پیدا ہونے کی جگہ روحِ نامیہ ہے۔ قلبِ مضغہ،
 تنِ فانی اور روحِ نامیہ کے اتصال سے ظہور میں آتا ہے۔

نفسِ امارہ، قلبِ مضغہ کی ایک قابلیت ہے جو حواسِ خمسہ سے پیدا ہوتی ہے
 اور انسان کو برائی کی طرف لے جاتی ہے، اِنَّ النَّفْسَ الْكَامَنَةَ بِالْاَسْوَعِ۔

انسان میں صفاتِ ستودہ بھی ہیں اور صفاتِ ذمیمہ بھی۔ سالک کو چاہیے کہ صفاتِ
 ستودہ کی حفاظت کرے اور صفاتِ ذمیمہ سے احتراز کرے۔ یہ صفاتِ جسدِ فانی کا خاصہ
 اور لازمہ ہیں اور ان کی تفصیل طولانی ہے۔ شاہِ معظم نے ان میں سے صرف پانچ کی طرف اشارہ
 کیا ہے:

۱۔ پانچ موزی، حواسِ خمسہ کے صفاتِ ذمیمہ، ان پر قابو پانا چاہیے
 ۲۔ ست مستیاں: ذات، وسیلہ، خوب صورتی، علم، ہنر، دولت، بادشاہی ان کو
 فنا ہے، اور آٹھویں مزی اللہ کے یاد کی ہے، اس کو بقا ہے۔ سالک کو چاہیے کہ وہ سات
 مستیوں کو فنا کرے اور آٹھویں مزی کو فروغ دے۔

۳۔ پانچ جہر: ایمان، شرم، عقل، کرنی (عمل)، صبر، ان کی حفاظت کرے۔
 ۴۔ پانچ چور: ایمان کا چور حسد، شرم کا چور طمع، عقل کا چور غصہ، کرنی (عمل) کا چور
 تکبر، صبر کا چور اذواءِ دہین۔ ان چوروں سے چوکس رہنا چاہیے۔

۱۔ سالک را اول مقامِ شیطانی است بعد ازاں راو شریعت معرفت السلوک (محمود خوش دہاں)
 ۲۔ مستی کے لیے جب کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے۔ ان کی تعداد اور تفصیل میں اختلاف ملتا
 ہے۔ ملاحظہ ہو، حضرت امین کے رسائلِ نشر و جود، نگار شاہ امین وغیرہ اور راقم الحروف
 کی تصنیف، سید شاہ امین الدین علی اعظمیؒ حیات اور کارنامے،
 ۳۔ جہر کے لیے فعل کی اصطلاح بھی مستعمل ہے۔

۵۔ چھ غفلتیں : طمع ، تکبر ، غصہ ، دہشت ، بیماری ، پیری ، ان پر قابو پانا چاہیے۔
جب سالک نفس امارہ کے دلو کو زیر کرتا ہے ، صفات ذمیمہ سے مجرد ہوتا ہے ،
صفات ستودہ کو اپناتا ہے ، فہم قیاس سے خدا کو پہچانتا ہے ، توحید اوقالی اختیار کرتا ہے
تجربہ و تفریق کی شرطوں کو پورا کرتا ہے تو وہ مقام شیطانی سے باہر آتا ہے اور ماہ شریعت پر
چل پڑتا ہے ۔ راہ شریعت میں ذکر علی ضروری ہے ، جس سے منزل ناسوت حاصل ہوتی ہے
خود فراموشی اور حال لازمہ منزل ناسوت ہے ۔ یہ کیفیت شہادت مہدا کے بغیر دور نہیں چلتی
اور جب دور ہوتی ہے تو وہ واجب الوجود سے مرتبہ ممکن الوجود میں داخل ہوتا ہے ۔
شاہ معظم نے ممکن الوجود ، متنع الوجود اور عارف الوجود کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا
ہے ، صرف اتنا کہا ہے :

اول چار تن سو گزرتا کہتے : شہادت یو تو حق سو پانا کتے
اس لیے متذکرہ بالا وجودوں کی تفصیل میں گئے بغیر صرف اسی شعری وضاحت کی جاتی ہے ،
سالک واجب الوجود سے ممکن الوجود کے مرتبے میں ، ممکن الوجود سے متنع الوجود کے مرتبے میں
اور متنع الوجود سے عارف الوجود کے مرتبے میں داخل ہوتا ہے اور عارف الوجود کی راہ معرفت
اور منزل لاہوت سے گزرنے کے بعد شہادت شہدا اختیار کرتا ہے ۔ یہ شہادت عارف الوجود
کے چھوڑنے اور قرب احدیت ذات کے لیے لازم ہے ۔ شہادت شہدا کے بعد تمام مراحل
مکمل ہو جاتے ہیں اور سالک کے لیے سعی و جہد کی تجالش نہیں رہتی ۔ وہ کامل تو ہو جانا
ہے لیکن مقام قرب سے سرفرازی اللہ تعالیٰ کی عنایت پر موقوف ہے ۔

بہر حال منازل و مراتب طے کرنے اور غفلات و اجازت حاصل کرنے کے بعد مغربی
۱۔ غفلتوں کی تعداد اور تفصیل میں بھی اختلاف ملتا ہے ۔ ملاحظہ ہوں ، حضرت امین کے رسائل
نثر ، وجودیہ ، گفتار شاہ امین وغیرہ اور راقم الحروف کی تصنیف ، سید شاہ امین الدین علی
حیات اور کارنامے ،

سفر پر روانہ ہوئے ۔ دوران سفر ان کی ملاقات خضر علیہ السلام سے ہوئی جنہوں نے انہیں
خلافت و ولایت کی مبارک باد دی ، اور شاہ کمال سے ملاقات کا مشرہ سنانے کے بعد
کہا کہ وہ تمہارے یار اور غم خوار ثابت ہوں گے ، ان پر تمام اسرار منکشف کیجئے اور سفر میں
انہیں اپنے ساتھ رکھیے ۔

اس واقعے کے کئی دن بعد شاہ کمال سے ملاقات ہوئی ۔ مغربی نے انہیں اپنے مریدوں
میں شامل کیا ، تربیت کی اور اپنے رنگ میں رنگ لیا :

کک دن کو آکر لے شہ کمال : کرم آن اور تب کیے شہ جمال
جمع کرمیدوں میں آن کو اول : چلے سیر کرتے ہو جنگلے جنگل
مرید پیر پر جاں فشانی کیے : اپس کو کتے اس میں فانی کیے
اپس میں اپیں یک دگر ہوئے : مرید پیر مل یک دگر ہو چلے
پیر اور مرید دونوں نے عرب و عجم کی سیر کی ۔ ایک ایک ملک اور ایک شہر کی خاک
پھانی اور جگہ جگہ بندہ نواز کی تعلیمات کی تلقین کی ۔ اس طویل سفر کے بعد جب وہ گلبرگہ لوٹے
تو بندہ نواز کا انتقال ہو چکا تھا ۔

سفر پیر کے جب آنے میں شہ جمال : شہنشاہ کا مقبہ ہوا تھا وصال
مغربی کے لیے یہ ماسخ ناقابل برداشت تھا ۔ انہوں نے شاہ کمال کو رشد و ہدایت کا حکم
دے کر بیجا پور روانہ کیا اور خود انتقال کر گئے ۔

۱۔ بندہ نواز کا انتقال ۲۵۵ھ ہجری میں ہوا اور انتقال کے وقت ان کی عمر ایک سو پانچ سال
چار مہینے بارہ دن تھی (سید محمدی ، صفحہ ۳۶)
۲۔ تذکروں میں مغربی کا سنہ وفات نہیں ملتا ، راقم الحروف کو ان کی تاریخ وفات کے تین ماہ
لے ہیں ، زاہد پاک جلال چشتی ، (۲۵۷ھ ہجری) ، جمال بندہ اداصل (۲۵۷ھ ہجری) (ابراہیم
جناں مشوہ (۲۵۷ھ ہجری) ۔ ان کے علاوہ یہ تاریخ بھی ملی ہے :

حسینی کے غم سوں وہ ناتاب لا سنا پھوٹ جا کر سو پھوٹا ہیا
 مرید کو کہے تم خلافت مگر بیجا پور تم (جا) ہدایت کرو
 اتارا ز عالم پہ کھو لو تمیں شہنشاہ کی بات برو تمیں
 مرید کے اوپر یو جوئے کلام دواع ہدیے شاہ دارالسلام
 شاہ کمال بیجا پور داد جوئے اور انھوں نے بہت جلد اہل بیجا پور کے دلوں کو مسخر کر لیا
 ادھی وضع دکن میں رہتے تھے ہدایت دوعالم کو کرتے تھے
 ہوا خلق دکن میں سب مرفراز تصدیق سوں ان کے کھاسب پرواز
 نبی کے مجالس میں جاتے تھے ملاکر ولایت دلاتے تھے
 کے متب یو دکن نے پایا شرف چو ا غلط سب یو چارو طرف
 اس کے بعد میراں جی شمس العشاق کا ذکر ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک حاجی مدینہ منورہ میں قیام پذیر تھے۔ ان کا نام

(باقی سلسلہ صفحہ ۱۵۷) وہم باد وجہ وفات حضرت مغربی قدس اللہ سرہ،
 شب جمعہ ششہ پجری کی توین صبیحہ علی اشعار سے ہوتی ہے

ریاضت میں کامل تھے مغربی خدا سات واصل تھے مغربی
 وجہ کا تھا مھینا اور جو کی دامت ہوا ہے سود میں کوں ان کا وفات
 تھے سات سو پو اسی چھ برس زمانے سے گم ہوا یو برس
 کسی قوی شہادت کی عدم موجودگی میں اس سے کسی سند کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔

۱۵۔ میراں جی کے مولد و منشا کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ خود نوشت میں لکھا
 ہے کہ ان کا آبائی مکان محلہ قریب شیر میں الہی بکر بن قحافہ میں مبارک کے گھر کے برابر تھا۔ ان کے
 والد نے ہندوستان سے ایک چٹھیا خاندان میں بیاہ کیا اور وطن لوٹ گئے، میراں جی کے بڑے
 میں پیدا ہوئے (خود نوشت مخطوطہ ۸۶۳-۸۶۴) ادارہ ادبیات اردو) تذکروں میں کہیں ہر اخصاً
 اہل کہیں اشارتاً ان کا مقام پیدائش بیجا پور بتایا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو بات

۱۵۔ میراں جی تھا۔ میراں جی کی دلی خواہش تھی کہ رسول کریم کو اس عالم میں دیکھیں۔ وہ بارہ سال تک
 حرم نبوی کی سیڑھیوں پر مقیم رہے اس یونے عرصے میں ایک ہی پہلو پر سوتے تھے۔ جس کی وجہ
 سے ان کے سارے جسم کو دیکھ چاٹ گئی تھی۔ ایک رات انھوں نے رسول کریم کو خواب
 میں دیکھا، صحابہ کرام بھی ساتھ تھے، میراں جی نے اپنا مدعا بیان کیا تو رسول کریم نے،
 حضرت علی سے کہا کہ انھیں بیعت سے سرفراز کریں۔ چنانچہ حکم نبی کی متابعت

(باقی سلسلہ صفحہ ۱۵۸) اپریل ۱۹۲۷ء میں اشارتاً مقام پیدائش بیجا پور بتایا ہے، لیکن اردو کی نشوونما میں
 صوفیہ کے کام کا کام میں مولد مکہ معظمہ ان رسالہ اردو بات اکتوبر ۱۹۲۹ء میں گجرات لکھا ہے۔ پروفیسر سردی
 عبدالحق کی مدد سے اس سے متفق معلوم ہوتا ہے (اردو نشوونما کا ارتقا صفحہ ۳) ڈاکٹر زور اور پروفیسر
 نذیر احمد کی رائے ہے کہ علوم متداولہ کی تکمیل کے بعد زیارت حرمین کو گئے (کئی ادب کی تاریخ
 صفحہ ۲۲، نئی رسمہ تاریخ ادب صفحہ ۲۰۹) ہدی علی مرید ثانی امین الدین علی کا بیان ان سب سے
 مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اصل ایشاں از پنجف اشرف است (بحوالہ خیال)۔ ۱۵۔

۱۶۔ خود نوشت میں نام، امیر الدین المعروف میراں جی لکھا ہے۔ مسافر نے شعور منکوم میں بھی
 یہی نام لکھا ہے۔ (مخطوطہ، کتب خانہ عجی محل) صاحب الزار الاخیار نے شمس الدین بتایا
 ہے۔ (مخطوطہ، محکمہ راقم الحروف) اور بعض شعروں میں بھی یہ نام ملتا ہے۔

۱۷۔ خود نوشت میں بارہ سال، تین ماہ اور پانچ دن، روضۃ الاولیاء (مخطوطہ ۲۶۶، کتب خانہ اصفیہ)
 میں پہلے مدت دراز اور پھر دو از دہ سال، سراج العشق (مخطوطہ ۹۰، تصوف، کتب خانہ
 سالار جنگ) میں چندیں سال، شبنوی خانی (کتب خانہ درگاہ امین) اور بحر الخیال، میں
 شش سال، مشکوٰۃ النبوة (مخطوطہ ۱۹۴، کتب خانہ اصفیہ) اور تذکرۃ القادری (مخطوطہ
 ۱۰۸۶، کتب خانہ اصفیہ) میں چندے، محبوب ذی المنن میں ایک جگہ چند مدت اور
 دوسری جگہ بارہ برس لکھا ہے۔

۱۸۔ خود نوشت اور تذکروں کے برخلاف ہدی علی کا بیان ہے کہ میراں جی روضۃ امیر المومنین
 اسد اللہ الغالب کے رو پر مقیم رہے۔

۱۹۔ یہ بیان مخالف آمیز ہے اور کسی تذکرے میں نہیں ملتا۔

میں حضرت علی نے انھیں بیعت و خلافت سے نوازا۔

نبی رحم کر کہے یا علی ۔ کہ وہاں کو بیعت خدا کے ولی

نبی کے بعد رسول کو بیعت کیے ۔ خلافت کی اس ٹھکانہ خلعت دیے

اس کے بعد رسول کریم نے میراں جی سے کہا کہ تم بیجا پور جاؤ۔ وہاں ایک شہر شاہ پور ہے، جو میرے فد سے محمود ہے۔ شاہ پور میں ایک ٹیلا ہے، جو دور سے دکھائی دیتا ہے، وہیں تم سے ظاہر میں ملوں گا۔ وہاں لوگ مجھے شاہ کمال کہتے ہیں،

نبی نے کہے اب تو پایا شرف ۔ ولے جاتا تو بیجا پور طرف

وہاں ٹیک دستا ہے یک دوروں ۔ چمکتا ہے روشن برے نوروں

اوجی ٹھار ظاہر ملوں گا تجھے ۔ ولے کیوں سچ تو سکے گا مجھے

وہاں لوگ کہتے ہیں مجھ شہ کمال ۔ اتا یا در کہ خوب میرا جمال

۱۔ خود نوشت کا بیان ہے کہ "سید الانبیا دست امین فقیر گزشتہ بدست حضرت علی کریم اللہ وجہ

پرندہ اند حضرت اسد اللہ الغالب نعمت بیکراں عطا یافتہ" مشکوٰۃ اور روضۃ الاولیا

میں اس کا ذکر نہیں ہے، مشکوٰۃ میں لکھا ہے "..... بعد ازاں شیخ حرم درویش نمودند کہ

آنحضرت علیہ السلام می فرماید کہ میراں جی را علی اند سلخ خانہ مادہ و حضرت ایشاں را در

معاملہ صادق فرمودند، اسے فرزند علم اند شیخ الحرم گرفتہ متوجہ بہ طرف دکن (رواند) شو کہ

نعمت تو در اینجا مقصوم یافتہ و بجا کے کہ ای علم بر زمین آید زمینہ جاسے سکونت و مدفن

تو است۔ پس علی الصبح حضرت ایشاں بہ شیخ طاق شدہ علم غالب را گرفتہ بہ طرف

دکن را ہی شدند، لہذا روضۃ الاولیا کا بیان ہے "وگنید مدت دوازده سال ملازم آستانہ بزرگ

بزرگ پهلوی خسیچہ بہ اشارہ جناب رسالت مآب صلوات اللہ علیہ رخت اقامت از انجا

محرّم برقیہ رخ عزیمت بہ دکن آوردہ"۔

۲۔ خود نوشت میں "ہند" روضۃ الاولیا اور مشکوٰۃ میں "دکن" لکھا ہے۔ البتہ مثنوی حالی اور بحر الخیال

میں شاہ پور ہے۔

۳۔ مخطوط میں شاہ کمال ہے۔

میراں جی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ دکن روانہ ہوئے۔ شاہ پور میں اسی ٹیلے پر جس کی نشان دہی رسول کریم نے خواب میں کی تھی، شاہ کمال کو دیکھا اور پہچان گئے۔ شاہ کمال نے انھیں سینے سے لے لگایا۔ اسی دن صبح عرف اور فقہا عرف کے اسرار سے واقف کرایا، تمام منازل اور مراحل طے کر آئے، بندہ نواز سے ملا۔ رسول کریم کی مجلس میں لے گئے، اور حضرت علی کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ دیا، خلافت عطا کی، شمس العشاق کے لقب

۱۔ سید علی پیر کا بیان ہے کہ میراں جی پہلے شاہ کمال الدین بیابانی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر وہاں سے شاہ پور آئے، انھوں نے اس مقام کا ذکر نہیں کیا ہے، جہاں دونوں کی ملاقات ہوئی لیکن انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی ملاقات شاہ پور میں نہیں بلکہ کسی اور جگہ ہوئی ہو سکتا ہے کہ یہ مقام گلبرگ ہو،

بروز شاہ کمال الدین رسیدہ کہ نعمت ظاہری ازو سے حشیدہ

ازاں جا آمدہ آن شاہ شہ پور ظہوری شد چوں بود چوں فور

(سراج المشق)

خود نوشت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے، "بر حکم معالی بہ ہند آمد" در خدمت شاہ کمال الدین

رسیدہ و چند ایام سعادت انجام خدمت کردم..... بر حکم پیر این فقیر در جھنگار کہ خدائی

کہ وہ چند روز ماندہ در خدمت بہ آمد۔ فرمودند کہ حکم نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام شدہ است کہ بہ

بیجا پور بروند و جاسے کہ اشارۃ نبی اللہ شود و را ہی ہا مستقیم و ساکن باشند۔ بعد ہی علی نے

صراحتاً مقام ملاقات گلبرگ بتایا ہے، "..... قصد دکن نمودند۔ چنانچہ منزل در منزل در

خیار گلبرگ تشریف رسیدند و در اُس ماہیں حضرت خواجہ کمال الدین بیابانی قدس اللہ سرہ پڑ

در راہ ملاقات کردند..... از انجا موجب حکم حضرت امیر المومنین اسد اللہ الغالب علیہ

الصلوات والسلام بہ شاہ پور (روضت شد) عزم فرمودند چنانکہ بعد از رسیدند (کنڈا)

انجا یک پشتہ کو ہی بر اُس استقامت و در بندہ.... " (بحر الخیال)

۲۔ سید علی پیر کی یہ وجہ لقب عطا رسوں۔ (سراج المشق) پھر بعد ہی علی کے بیان

کی یہ وجہ عطا کے حضرت علی سے (بحر الخیال)

سے سرفراز کیا اور بیجا پور میں رشہ ہدایت کا منصب تفویض کیا۔ چہرہ خدائی کا حکم دیا اور بشارت دی کہ تم کو کئی اولاد ہوگی اور اُن سے تمہارا سلسلہ جاری رہے گا۔ پہلا لڑکا بہت جلد ہوگا، جو بڑا قطب اقطاب ہوگا۔ لوح پر اس کا نام برہان لکھا ہے اور ملائک اس کو ظل سبحان کہتے ہیں۔ اس پر تمام اسرار منکشف ہوں گے اور خاص و عام اس کی پرستش کریں گے۔ خانوادہ چشت میں اس کا بڑا نام ہوگا۔ ہمیں تمہارا بڑا انتظار تھا، تم کو دیکھ لیا، اب تمہارے فرزند کو دیکھنے کی آرزو رہ گئی ہے۔

جب تمام مراحل طے ہو گئے تو شاہ کمال نے میراں جی کو آگاہ کیا کہ انھیں اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا ہے کہ سفر اختیار کریں اور فاتحہ پڑھ کر اسی دن شاہ پور سے روانہ ہو گئے۔ میراں جی نے اسی ٹیلے پر سکونت اختیار کی، جس کی ان کو بشارت دی گئی تھی لوگ جوق در جوق آنے اور ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک شہر بس گیا۔ اُن کی شہرت ملک میں دور دور تک پھیل گئی۔ جو کوئی ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہوتا وہ فاضل اور داصل کے مقام پر پہنچ جاتا۔ غرض وہ ایک مدت تک باطن کے دیس کی بادشاہی کرتے اور خلق خدا کی ہدایت کرتے رہے۔

میراں جی کو حق و انجیر روشن کیا * اُسی ٹیک کو حق نے گلشن کیا
وہی ٹیک پر جب ہوا ہے نشر * اُسی ٹھار آکر بسا ہے شہر
دیکھے خلق حق پر یو مشتاق ہے * یو برحق کہے شمس عشاق ہے
ہوا غفلا سب پر چار و طرف * جکونی آملیا سو ادایا شرف
اول غل ادٹھا ہے کتے شہر میں * نشر تب ہوا ملک اور دہر میں
اتھا علم ظاہر تو اُن پر تمام * ہوا علم مکتوف باطن تمام
بہت خلق کو شاہ ہدایت کیے * بہت خلق کو راز نعمت دیے
کیے سب پر اظہار باطن کے راز * امر جیوں کیے تھے وہ بندہ نواز

جکونی آملیا سو ود کو مل ہوا * او فاضل ہوا اور داصل ہوا
کتے دیس باطن کی شاہی کیے * امر جیوں ہے تیں راہ نائی کیے
میراں جی نے رسول اور پیر کے حکم کی متابعت میں شاہی کی پہلے اور ان کے گھر لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام برہان رکھا گیا۔ جب لڑکے کی عمر پندرہ سال ہوئی تو اس پر چھپے قال کا شوق غالب ہوا۔ میراں جی نے بیسے کو مرید کیا اور سفر پیر روانہ ہونے کا حکم دیا، اس لیے کہ

بجز رنج کوئی گنج پایا نہیں * سو محنت بجز مار نایا نہیں
سفر میں شاہ برہان نے کئی نعمتیں پائیں اور تین سال بعد گھر لوٹ آئے، میراں جی نے ان کی تعلیم و تربیت مکمل کی، خلافت عطا کی اور اپنا جانشین بنا کر اس دنیا سے کوچ کیا۔

معظم شاہ برہان کی توصیف میں کہتے ہیں:

اتما صفت کرتا ہوں برہان کا * او برحق دسا ظل سبحان کا
او عتقان ہے اور منان ہے * او دیان ہے اور برہان ہے
یو کعبہ دسا توچہ برحق کتے * خدا کا اُسے بیت مطلق کتے
جکونی آملیا سو وہ حاجی ہوا * وہ عالم منے سچہ ادنا جی ہوا
ہوا راز اظہار برہان سوں * جواہر نیچتے ہیں جیوں کھان سوں
مکمل ولی شیر یزداں ہوا * جلالت بھرا سیف برہان ہوا
دیا حق نے باطن کی دولت اُسے * یو عصمت، سکت اور کرامت اُسے
اول تو شریعت کو دے کر رواج * طریقت اُن کا اتھا سچہ مزاج

۱۔ بر حکم پیر این فقیر در جھنگار کد خدائی کردہ چند ماہ ماندہ، در خدمت پیر آدم، خود نوشتہ
مخطوطہ ۸۶۳، ادارہ ادبیات اہل حق۔

حقیقت اوفو پر تو احوال تھا : دیکھو معرفت کا یوسب قال تھا
 اول رکھ مریدان کو ناسوت میں : لیجاویں کتے ان کو ملکوت میں
 سو جبروت میں ان کو کر مستقیم : دلاتے ہیں اس ٹھار خلعت عظیم
 سو بعد از لیجا اس کو لاہوت میں : سو لاہوت میں اور ہا ہوت میں
 معظم کہتے ہیں کہ شاہ برہان کے چار خلفا تھے، خلفا کے خلفا کی تعداد ہزاروں
 تک پہنچتی تھی اور مرید تو بے شمار تھے۔

نبی سوں لیجا کر ملاتے تھے او : ملاکر ولایت دلاتے تھے او
 او کیا زیب دیتے تھے من عرف کو : دیکھاتے تھے میم کے حرف کو
 مریدان دیکھو شاہ کے خوب ہیں : ایکس سو دیکھو ایک محبوب ہیں
 خدا کے چھپے راز کے جام کو : پلاتے ہیں سب خاص اور عام کو
 یو پند اپنا جب او کرتے ہیں واز : یو خادم ہو مخدوم تو سرفراز
 شاہ برہان نے تصنیف و تالیف پر بھی توجہ دی اور ان تصانیف کے ذریعے
 دور دور تک ان کی تعلیمات پہنچیں :

کتاباں جو سے اور چلا یہ کام : بلخ اور بخارا یوسب روم و شام
 شاہ برہان کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کی بیوی امید سے ہیں تو ان کو بڑی خوشی ہوئی اپنی
 اس خوشی میں مریدوں کو شریک کرنے کے لیے انھوں نے یہ خبر سب کو سنائی اور ہونے
 والے نیچے (امین) کے اوصاف بیان کیے :

۱۔ رانم الخوف کو ان کے اکیس خلفا کا پتا چلا ہے۔ ملاحظہ ہو : سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ - حیات
 اور کارنامے صفحہ ۱۰۸ اور صفحہ ۶۲۳

۲۔ مہدی علی کا بیان ہے : تصانیف اک حضرت (جانم) نیز بیچ شش جلد است (بحوالہ خیال)
 اور صاحب شکرہ لکھتا ہے : چند رسائل در علم معرفت الہی از تصانیف اوست۔

سنے گھر میں امید ہے شاہ نے : کیے لہج شادی سو جم جاہ نے
 اُسی روز شہ نے دیے سب خبر : صفت سب امین کی کہے کھول کر
 خدا کا کہے شیر آتا ہے یو : برابر چھپے گنج لاتا ہے یو
 اس خوش خبری کے ساتھ یہ اندوہ ناک خبر بھی سنائی کہ ان کا وقت موعود آئے پہنچا، ایک
 جنگل میں دو شیر نہیں رہ سکتے اور ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں،

کہے اب طلب مجھ کیا ہے حضور : اتا مجھ کو جانا ہوا لا ضرور
 نیک ٹھار دول کے رہتے پلنگ : نیک میان میں دو ساتے فرنگ
 کہے سر او پر ہے تمھارے خدا : ہیں اب تمھارے سوں بچتے دول
 اس کے بعد اپنے نامور خلیفہ سید صاحب گہر (سید علی گنج گوہر) کو مخاطب کر کے
 کہا : امین کو ہمارا سلام کہنا اور ان کو تمام اسرار و رموز سے واقف کرانا۔ پھر حضرت امین

۳۔ حضرت امین کی ولادت سے متعلق روایات و کرامات پر مشتمل ایک مثنوی امین نامہ ہے، جس کے
 مصنف خداوند شاہ ہیں۔ اس مثنوی کے بیان کے مطابق بندہ نواز نے جانم کو عالم رویا میں
 حضرت امین کی ولادت کی بشارت دی تھی اور ان کے اوصاف بیان کیے تھے :

حسینی کیے شاہ برہان دہی تر سے پیٹ میں سے یو حضرت امین
 تمیں ان کو جانو ولی العظیم : ہیں جس کوں بخشے دکن کی زمیں
 اس بشارت سے جانم نے اپنے مریدوں کو مطلع کیا (امین نامہ، مخطوط کتب خانہ درگاہ امین، بیجاپور)
 ۴۔ امین نامے کا بھی کم و بیش یہی بیان ہے لیکن صاحب مجمع الانساب لکھتا ہے : چون وقت رحلت
 شاہ برہان الدین صاحب عن قریب رسید محمود خوش دہاں و خداوند خدا نا را طلب فرمودند۔ ہر
 دو صاحبان از بیدر بہ بیجاپور تشریف آوردند و از ایشان نعمت قادر یہ اخذ فرمودند و نعمت
 چشتیہ بہ ایشان عطا نمودند۔ بہ خداوند خدا نا وصیت فرمودند کہ ایں نصرت خدا ناں چشتیہ کہ
 شہرا عطا نموده ام، ایں امانت فرزندم شاہ امین الدین کہ من قریب ظہور اوست بہ رسانند
 و بہ شاہ محمود خوش دہاں وصیت فرمودند کہ صاحب پیر تربیت او باشند (باقی سلسلہ ۲۶ پیر)

کے لیے کلاہ اور شجرہ حوالے کیا لے اور رحلت کی۔

چند دن بعد حضرت امین پیدا ہوئے۔ وہ مادر زاد ولی تھے۔ روزِ اول ہی ان کو علم سینہ و سفینہ کی دولت عطا ہو چکی تھی۔ وہ بڑے ہوسے تو ان کی شہرت دور دور تک پھیلی اور ان کے فیضان سے سارا ملک بہرہ ور ہوا۔ شاہ کمال نے ان کے بارے میں جو بشارت دی تھی، وہ پوری ہوئی۔ جس کسی نے ان کو قریب سے دیکھا اس کا شمار اولیاء اللہ میں ہونے لگا۔

(باقی صفحہ ۱۶۵ سے) ہوتا جنہی کہ علوم ظاہری و باطنی باشند و محنت نماند بہ پوچھ کر اور رضائی و ربہ حضرت ایشان بعد وصیت فرمودند کہ تربیت دستار و گفتار و قول و فعل و نشست و برخاست نماید۔

(سید محمد الدین قادری، مجمع الانساب، مخطوط کتب خانہ گنجی محل، بیجاپور)
لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت امین کی تعلیم و تربیت بھی محمد غوث دہاں نے ہی تھی اور خاندانہ قاعدہ یہ اور پشتہ میں بیعت و خلافت بھی انھوں نے ہی دی تھی (خلافت نامہ باب شاہ معینی، قلمی، ملوک سید امین الدین قادری ہاگیر دار جہاں پور) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ، حیات اہل کارنامے، صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۴۔

۱۔ صاحب مشکوٰۃ لکھتا ہے کہ حضرت امین الدین علی اعلیٰ ہنوز در شکم مادر بود کہ شاہ برہان روزی کلاہ مبارک بر شکم مادر ایشان نہادہ فرمودند کہ امین الدین در شکم تو است، امی خرقہ امانت اوست، بایہ بدورسانی اور یہ کلاہ حضرت امین نے از دست شاہ عطاء اللہ حسینی کے ہم پیشاں بودند پوشیدند۔ بعض تذکرہ نویس میں لکھا ہے کہ حضرت امین کو بیعت و خلافت بھی شاہ عطاء اللہ حسینی سے حاصل تھی (روضة الاولیاء، بحر الحیال) لیکن یہ درست نہیں ہے۔

۲۔ ہمدانی علی کا بیان ہے کہ شاہ برہان نے یہ وصیت کی تھی کہ بعد از رحلت من فرزندے کہ پیدامی شود آکر از آوردہ تا چہل روز در دن غلافہ مرقوم بنوا تا بندہ بعد از چہل روز غبرش بگیرد۔ اور ایسا ہی کیا گیا لیکن پچیس دن بعد جب ان کی ماں بے چین ہو گئیں تو بچے کو گھر لایا گیا (بحر الحیال)۔

۳۔ مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ جانم نے اپنے خلفا سے کہا تھا: ادا (حضرت امین) علم ظاہر بنو امارا لہا سے کہنی پیش لہ چنان خواندہ باشد کہ نسیع اور سیدہ با مشید۔

مُعظم، حضرت امین کے تربیت یافتہ تھے، اس لیے بڑے پیار اور مان سے ان کا ذکر کرتے ہیں:

دنیا میں کیتک دن کو آیا امین : برابر چھپے گنج لایا امین
اُسی ٹینک پر چاند بالا ہوا : دنیا دین میں سب اُبالا ہوا
ہوا غفلت ملک میں شاہ کا : اُجالا پڑا اُس پہ اس ماہ کا
ازل سوں اُسے حق بود دولت دیا : ولایت کی خلعت عنایت کیا
اول سوں اُسے راز کا علم تھا : ازل سوں اُسے علم اور علم تھا
اول سوچے بولے اتھے شاہ کمال : امین ہوسے گا ایک صاحب جمال
اُسے خوب دیکھا سو ہوگا ولی : اُسے کشف ہوگا خفی او علی
اُسی وضع سوں دیکھ عالم تمام : اُسی وضع سودا ذکر خاص و عام
نوازا گدا کئی مرے سار کے : کیا بادشاہ اُن کو اسرار کے
نظر بھرا امین کو سر دیکھا ہوں میں : سدا ذات میں غرق دیکھا ہوں میں
سدا کیف میں مست مانتے اتھے : سدا عشق میں حق کے راتے اتھے
پلک عشق کا نیچہ کھولے کبھی : بجز راز نہیں بات بولے کبھی
غوط کھا کے وحدت کے دیانے : اولائے سوتھے گوہر ان گنے
اسی کام میں شاہ مشغول تھے : اسی کام سوں حق کے مقبول تھے
زمانے کے شاہاں پرستش کریں : جکچک مال و من لاکے آگے دھریں
حضور ہی منے حق کے وہ غرق تھے : وصل سوں کبھی نیچہ وہ ذوق تھے
وہ ظاہر تو لئی مست سرشار تھے : ولیکن او باطن میں ہوشیار تھے

مُعظم نے حضرت امین کی دو کرامتیں بیان کی ہیں،
حضرت امین کے ہاں ایک سنیا سی آیا۔ وہ ادا اسی تھا۔ اس نے حضرت امین کو پاس

نذر کیا، لیکن انھوں نے اس کو شاہ پور کے تالاب میں پھینک دیا۔ سیاسی کو بڑا دکھ ہوا اور وہ رونے لگا۔ حضرت امین پہلے تو مسکرائے پھر اس سے کہا: جاؤ تالاب میں سے اپنا پتھر نکال لاؤ۔ وہ گیا اور فوراً پتھر نکال لایا۔ اس واقعے سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

طاشہ سوں ایک سنیا سی کتے : سنیا سیوں میں تھا وہ آدمی کتے
امین کو اُنے لاکے پارس دیا : لوہے کو لگا تو چہ سنا کیا
کہا لیمہ محنت سوں پایا ہوں میں : تمہارے لیے توجہ لایا ہوں میں
یہ سوئے شہ نے عرقاب میں : سوش پور کے دیکھ تالاب میں
ہے مشہور رو بات سب دہریں : ہر یک ملک میں اور ہر یک شہر میں
ادبار سسٹے کر کے زاری کیا : سنیا سی نے جب اپنی خواری کیا
اوسے دیکھ کر شہ تبسم کیے : سنیا سی کو بعد از امر یوں دیے
کچے شہ جا دیک پانی بھتر : وہاں دیکھ کر لے تو اپنا پتھر
اوسی وضع سوں بیٹھ پانی منے : کیتک دیک پایا ہے پارس گنے
دیکھا کشف شاہ کا ہو اعتقید : کلید کہا اور ہوا ہے مرید

دوسری کرامت وہ ہے جو عام طور پر تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تذکروں میں ملتی ہے۔ سید بخاری نام ایک بزرگ حافظ، قاری اور صاحب شریعت تھے۔ انھوں نے حضرت امین کو کہلا بھیجا کہ آپ عبادت سے کیوں غفلت برتتے ہیں۔ آئیے آپ اور ہم مل کر نماز جمعہ ادا کریں۔ حضرت امین نے جواب میں کہلویا کہ دیو نہ کیجیے۔ فوراً چلے آئیے، اور خود تالاب پر مصلیٰ بچھا کر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سید بخاری نے یہ

۱۔ مشکوٰۃ الفہمۃ، روحۃ الاولیاء و تذکرۃ القادری

۲۔ سید محمد بخاری صاحب علی باغ جو اس عہد کے جامع شریعت و طریقت بزرگ تھے، اور سلاطین و امرا کے ہاں بھی ان کی بڑی تدر و منزلت تھی۔

منظر دیکھا تو اوسان خطا ہو گئے اور سوچنے لگے کہ یہ کیا مصیبت اُن کھڑی ہوئی۔ یہ واقعہ شہر اور شہر کے باہر دور دور تک مشہور ہوا۔ اس واقعے کے بعد حضرت امین نے اپنے خلیفہ سید خداوند کو طلب کیا۔ اور ان کے ذریعے سید محمد بخاری کو اپنا پیام بھیجا، جس میں شریعت اور طریقت کے بارے میں اپنے مسلک کی وضاحت کی ہے۔

معظم، سید خداوند کے بارے میں لکھتے ہیں:

امین کے مقرب اتھے یک فقیر : اتھا علم تحصیل، روشن ضمیر
خلیفوں منے او اتھے بہرور : او سید خداوند تھے نامور
ہر یک علم میں خوب قابل اتھے : او فاضل اتھے اور واصل اتھے
لدنی کتے علم اظہار تھا : کتے حال اور قال سب بار تھا
مریدان اتھے اُن کے کئی حق رسید : او دیکھے اتھے حق کو جبل الوریڈ
ہر یک بات میں خوب طار اتھے : او ہر یک مجالس میں درکار تھے
سید خداوند کے ذریعے حضرت امین نے جو پیام بھیجا، وہ یہ ہے:

شریعت او پر یونچہ قایل رہنا : چھپے راز پر یونچہ مایل رہنا
نبی نے احادیث میں یوں کہے : عبادت کتے دو وجہ کا ہے
عبادت ہے ظاہر کی صوم و صلوٰۃ : سمجنا ہے باطن میں ذات و صفات
بندہ کس کو کہتے سمجنا اول : کھڑے گا اوسے توجہ حق کا وصل
نبی نے دیکھو کھول کر سب کہے : عبادت خدا کا تو نوعان ہے
کتے یک حقیقت ہے دوسرا حجاز : ولیاں کا ہے باطن میں روزہ نماز
شریعت پہ قائم ہے، زائد کتے : کریں تن سوں بندگی سوعابد کتے
طریقت برتتے سوعارف ہیں جان : حقیقت پہ مائل سوعاشق ہے مان

کھلا معرفت اوجہ واصل ہوئے * دو واصل ہوئے اور کامل ہوئے
 ہمیں یوں کرتے ہیں روزہ نماز * سمجھتے ہیں حق کا یو واز و نیاز
 عبادت تو ظاہر کی یہ فرض ہے * خدا کا یہاں دیکھنا فرض ہے
 اول تو سمجھنا ہے یہ بات کو * تو سمجھ گامی حق کی وہ ذات کو
 امر یوں کہے ہیں وہ حق کے رسول * امر سب نبی کا کیے ہیں قبول
 شریعت بجز راہ دستا نہیں * شریعت بجز باثبستا نہیں
 شریعت زمین کر سو بولے رسول * امت پر یہ سب راز کھولے رسول
 طریقت نبی نے کہے ہیں شجر * حقیقت سو اس کو نگاہے ثمر
 کہے معرفت اس کی لذت تئیں * انیڑتے ہیں واصل سود و لذت تئیں
 شریعت نبی نے کہے رات ہے * اندر گرد جیوں کہ ظلمات ہے
 طریقت نبی نے ستارے کہے * ولے کچھ بھی دستے ہیں تارے کہتے
 حقیقت سو جیوں چاند اور چاندنا * چکور ہو کہ عاشق نے دل باندا
 دیکھو معرفت کو کہے آفتاب * چھپا راز اظہار ہوتا شتاب
 شریعت ہے کشتی نبی نے کہے * ہوا سار سو وہ سلامت رہے
 طریقت کو دریا ہے کہ جاننا * جو اہر میں بھر پور کر ماننا
 حقیقت صدف کہے ہیں رسول * او سے بات لینے سے ہوتا و رسول
 کہے معرفت ذات ہوتی ہے جوں * او سے عاشقان بات لیتے ہیں یوں
 شریعت نبی نے کہے قال ہے * طریقت مرا سب یو افعال ہے
 حقیقت ہے احوال بجز پر مدام * دیکھو معرفت ذات سب ہے تمام
 بجز یوں چلے ہا سے پاتا نہیں * بجز راہ کچھ بات آتا نہیں

حضرت امین کے اس پیام سے سید محمد بخاری بہت متاثر ہوئے اور ان کی

تعلیمات کو قبول کر لیا۔ عام لوگوں میں اس واقعے کا چرچا ہوا تو وہ بڑی تعداد میں حضرت امین
 کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے اور ان کی ولایت کو ہر ایک تسلیم کرنے لگا۔ اب ان کے
 دائرہ اثر میں صرف مسلمان ہی نہیں تھے، ہندو بھی تھے، جو بقول معظم کی لاکھ کی تعداد میں
 مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔

۱۰ حضرت امین کے حلقہ ارادت میں ہندو بھی یقیناً شامل ہوں گے، لیکن ان کے بارے میں تک کوئی
 معلوم نہیں پہنچ سکی ہیں۔ راقم الحروف کو ان کے صرف ایک ارادت مند کا پتا چل سکا ہے، جن کا
 نام چٹا ویرا تھا۔ حضرت امین نے انھیں فقیر سوائی کا نام دیا تھا اور وہ اسی نام سے مشہور ہوئے
 انھیں فقیر شاہ بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت امین ہی نے ان کی پرورش اور تربیت کی تھی۔ ان کا مٹھ
 سرہٹی میں ہے جو گدگ کے جنوب مشرق میں بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ فقیر سوائی
 کے موجودہ جانشین سردارام سوائی ہیں، جو ۱۷ نومبر ۱۹۹۹ء کو اس منصب پر فائز ہوئے۔ یہ
 اس سلسلے کے دسویں سوائی ہیں۔ یہاں یہ طریقہ اب تک رائج ہے کہ جانشین پہلے حضرت امین
 کے سلسلہ ارادت میں شامل ہوتا ہے اور فقری کی تمام رسومات ادا کی جاتی ہیں، پھر شام میں
 ہندوؤں کے مخصوص طریقوں سے جانشینی کی رسم ادا ہوتی ہے۔ حال حال تک حضرت امین
 کے سوا سوائی کو فقرائے حضرت امین میں شامل کرنے کے لیے بیجا پور سے آیا کرتے
 تھے، لیکن اب یہ رسم منسوخ ہو کر والے ادا کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ نقار خانے میں ہر جمعرات
 کو حضرت امین کی فاتحہ ہوتی ہے۔ نقار خانے کی تعمیر میں اسلامی خصوصیات ملتی ہیں۔ پہلے
 اور آخری مینار پر چاند بنے ہوئے ہیں۔ سب سے دل چسپ چیز یہ دیکھنے میں آئی کہ میرے
 سوائی کی سادھی کے دروازے کے اوپر ناد علی کندہ ہے۔ لیکن ہے ان سے پہلے اور بعد کے
 سوامیوں کے سادھیوں کے دروازوں پر بھی ناد علی کندہ ہو جو امتداد زمانہ کے ہاتھوں باقی
 نہ رہی ہو۔

کہتے ہیں کہ امین اپیا، جنھیں مون اپیا بھی کہتے ہیں، نانی ایک اور ہندو بزرگ حضرت
 امین کے فیض یافتہ تھے۔ ان کا مٹھ تفتی میں واقع ہے۔ راقم الحروف نے یہ مٹھ نہیں دیکھا۔

یہی بات سن کر سواہل ہنود : کنگ لاک عالم کیا آسمو
کنگ لاک دیکھا ہوں زنا روا : امیں کے اوپر آکے ہوتے نثار
کنگ لاک جنگم کیا آسمو : کیے آکے تحقیق اپنا وجود
یو میں میں کتا چہ میں سو کون ہے : او صاحب کو اتا سودہ کون ہے
پو چھے پر کہے بات یو راز کا : امر جیوں اتھا ان کو شہباز کا
چھے راز سوں جب او باہر ہوے : کنگ لاک کافز سوشا کر ہوئے
میں دیکھا تاشا یو اپنی نظر : امیں سوں ملا سو ہوا بہرور
حضرت امین کا تذکرہ ختم کرتے ہوئے معظّم کہتے ہیں وہ گیارہویں صدی کے ہادی تھے
اور ہمارے لیے تو ان کی حیثیت ہمدی کی تھی۔ انھیں لوگ مجذوب کہتے تھے لیکن دراصل
وہ سالک تھے اور مقام محبوبیت پر ناز تھے :

اگیا را صدی میں یو ہادی ہوا : ہمارے تو حق پر یو ہمدی ہوا
ہوا خلق اس بات پر معتقید : خدا کو دیکھانے میں شہ کے مرید
امیں کو کتے خلق مجذوب تھے : او سالک اتھے اور مجبوب تھے
ہوا تھا امین سچ پر غانی فی اللہ : رہا تھا امین سچ ہو باقی بال اللہ
حضرت امین کے بعد ان کے صاحب زادے بابا شاہ حسینی کا ذکر ہے۔

شاہ معظّم کہتے ہیں کہ حضرت امین اپنے فرزند دل بند کو پیار سے شاہ بابا کہتے تھے اور
انھیں بے حد عزیز رکھتے تھے۔ وہ حضرت امین ہی کے چچے نہ تھے بلکہ ہر ایک ان سے

لے تذکرہ دل کا بیان ہے کہ جب بھی آپ کے ہاں بچہ پیدا ہوتا، اس کے چہرے پر بات رکھ کر کہتے،
بابا آرام کرو۔ بچے کا اسی وقت انتقال ہو جاتا۔ جب بابا شاہ پیدا ہوئے تو ان کی ماں نے حضرت امین
سے اس وقت کو پوشیدہ رکھا اور ان کی پرورش کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ بابا شاہ کی عمر ۱۲ سال ہوئی
ایک دن اتفاقاً باب بیٹے کا آئنا سامنا ہو گیا۔ ماں حیران و پریشان تھیں کہ دیکھتے اب کیا ہو،
اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، حضرت امین نے بچی سے مخاطب ہو کر کہا: کیوں بری
ہوتی ہو، یہ بابا حسینی ہیں، خدا اس کی نسل کو تمام اور برقرار رکھے۔ (مشکوٰۃ)

پیار کرتا تھا۔ وہ حق آگاہ تھے، اور عشق حقیقی کے نشہ سے سرشار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے
انھیں دنیا اور دین دونوں سے سرفراز کیا اور مقام قرب سے نوازا تھا۔
حضرت امین نے تعلیم و تربیت کے بعد شاہ بابا کو خلافت عنایت کی اور اپنی
مسند ارشاد پر بٹھا کر گویا اپنا وارث اور جانشین مقرر کیا۔

امیں کا دیکھو چاند روشن ہوا : زمین اور زماں سب یو گلشن ہوا
کتے شاہ بابا او سے پیار سوں : امیں کا اتھا پیار دل دار سوں
اول سوں او سے حق نے ماتا کیا : او سے عشق میں اپنے راتا کیا
امیں کا تو برحق وہ فرزند تھا : ولکین دو عالم کا دل بند تھا
دنیا دیں سب حق دیا تھا او سے : قرب دار حق نے کیا تھا او سے
امیں نے حضور سوں خلافت دیے : مریدان کو در اجازت دیے
شاہ بابا کی شادی بھی حضرت امین ہی نے کی تھی :
حضور سوں دیکھو کہ خدائی کیے : او سے تخت اور تاج اپنا دیے
حضرت امین کی زندگی ہی میں شاہ بابا صاحب اولاد ہوئے ان کے رُے صاحب
کا نام حضرت امین ہی نے علی رکھا تھا :

امیں نے کہے نام ان کا علی : او برحق خدا کا ہوا ہے ولی
حضرت امین اپنے پوتے سے بہت پیار کرتے تھے، اسی پیار کی وجہ سے یہ
سونا اکسیر بنا :

امیں کا کتے شاہ پر پیار تھا : امیں کا وہ محصوم دل دار تھا
کھلاتے تھے پیار سواں امیں : بلاتے تھے چاوسوں اس امیں

لے ہمدی علی کا بیان ہے گویند کہ آنحضرت سر مرتبہ خاں خود را سوزا نیندند، حق فرمودند کہ رجب ایسا
این جہاں اسباب جمعیت باطن را پرگندہ می کند (بحر الخیال)

اسی پیار کی دیکھ تاثیر سوں + ہوا دیکھ کنچن یو اکسیر سوں
 معظّم، علی پیر کا ذکر بڑی محبت اور احترام کے ساتھ کرتے ہیں اور اس قدر غرور
 الحاح کے ساتھ اُن سے لطف و کرم کی التجا کرتے ہیں جیسے علی پیر ہی ان کے شیخ ہیں۔
 مرے حق پہ والی محشر ہے تو + مرے حق پہ ساقی کو شر ہے تو
 اے ساقی اتا جام دے پیار سوں + اتا مست کر اپنے اسرار سوں
 ازل سوں کیا حق لے ساقی تجھے + پلا جام اے شاہ باقی مجھے
 ابد لگ رہوں مست ماتا ہو میں + ترے عشق میں مست راتا ہو میں
 پلا کر ایتنا سچ کو سرشار کر + چھپا راز سب مجھ پہ الہیار کر
 ہمیشہ ثنا صفت کرتا رہوں + تیری یاد کا دم یو بھرتا رہوں
 تصدق ترے مال اور جان کا + مجھے دان دے شاہ ایمان کا
 علی پیر کی طرح کے خاتمے پر شاہ معظّم کہتے ہیں کہ میں آپ کو عالم شہادت میں علی
 سمجھتا ہوں لیکن بہ باطن قادر (قادر لنگا کو تال)۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ علی پیر
 کے زائد رشد و ہدایت سے پہلے ہی شاہ معظّم کے شیخ شاہ قادر لنگا کو تال کا وصال
 ہو چکا تھا۔ اس لیے معظّم علی پیر کو حضرت امین کے وارث اور جانشین کی حیثیت سے
 بے حد عزیز رکھتے تھے اور انھیں بہ یک وقت حضرت امین اور حضرت قادر لنگا کا
 قائم مقام تصور کرتے تھے۔

آخر میں معظّم اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ یہ دنیا ناچیز اور بے وفا ہے۔
 اس سے دل لگانے میں سراسر زیاں ہے۔ طالب دنیا محنت اور طالب جنت مونت
 ہوتے ہیں۔ مرد وہی ہے، جو نہ ا کا طالب ہے۔ اس لیے اے معظّم اٹھ اور ساقی سے جام
 عوفاں طلب کر۔ یہ تیری خوش قسمتی ہے کہ تجھے امین جیسا ساقی نصیب ہوا ہے۔
 اتا اٹھ توں ساقی سو جا کر عرض + اگر بے حشر کا تجھے یو غرضی

اتا جام دیتا ہے آب حیات + اتا تاج کو مرنے سو ہو گا نجات
 عبث عمر ناچیز کھوتا ہے تو + عبث بھار دنیا کی ڈھوتا ہے تو
 اے دنیا تو ناچیز ہے بے وفا + اے پیار کرنے میں کیا ہے نفا
 طلب اس کی رکھنے میں ہوتا کلا + اے دور کر سنوں کیا تاجے لاب
 دنیا کے ہیں طالب محنت کتے + ہیں جنت کے طالب مونت کتے
 جو طالب خدا کے سو وہ نہ ہوے + مذکر ہوے اور بہرور ہوے
 اسی واسطے میں کتا ہوں تجھے + ہوا دیکھ ناچار کہنا تجھے
 امیں ساتھ دیکھ مرشد ملا + تو مشہور ہو تجھ کو شاہد ملا
 اتا چھوڑ دے دل سوں غفلت کی کام + اتا جام سوں کام لا توں دام
 اتا چھوڑ سب تن کی ہستی کو توں + اتا چھوڑ دنیا کی ہستی کو توں
 اتادام کو ناچیز نا جان دے + اتا نفس کو دل میں نا اُن دے
 امیں ساتھ دیکھ ساقی ملا + بڑے بخت سے تاج کو باقی ملا
 ہمیشہ اتا مست سرشار ہو + اتا یار سوں مل کے توں یار ہو
 اتا یار سوں مل کے تو ایک ہو + اپس سوں جو اس کو نالیک تو
 عجب جام ہے ہات میں یار کے + سو اس یار چر سار دل دار کے
 یو جو دیکھ لے یار اس جام کو + نہ کر عذر دیکھ اس کام کو
 دادم تو اس جام کو فوش کر + دنیا دین کو سب فراموش کر
 اسی سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ اے معظّم میری زندگی کی شب قریب الختم ہے۔
 صبح کا ذب نمودار ہو گئی ہے۔ اس لیے شراب کہنے کے جام جلد جلد پیتا چلا جا:
 ہوا صبح کا ذب تو کرنا شتاب + پینا بیگ کہتے ہیں کہ شراب
 اس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ شجرۃ الاتقیا، ستارہ معظّم نے اپنی زندگی کے آخری

مثنوی کے ابیات کی تعداد (۵۰۰) بتانے کے بعد اپنے پیر کے ذکر پر مثنوی کو ختم کرتے ہیں :

یو مکتوب کیا بھار ہے بار دار ۛ دیکھو سب یو وحدت سوں آیا پہل
اتا پانچ سو بیت بولا ہوں میں ۛ جو بولو کہے سوچ کھولا ہوں میں
او قادر غیور (اور) داناکتے ۛ چھپی بات نا بھار کرنا کتے
معظم آتا ختم کر بات کو ۛ اتار کھ قلم تو ایس بات کو
شجرۃ الاتقیا، معظم کسی سب سے طویل مثنوی ہے۔ ان کی دوسری مثنویوں کی
طرح اس مثنوی کی زبان اور اس کا اسلوب بیان دونوں سبک، سلیس، رواں اور
پُر زور ہیں۔ واقعات اور روایات، شاعر کے اظہار پر ایک طرح سے پابندی عاید کر دیتے
ہیں اور اس کی جولانی طبع کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے لیکن ان تحدیدات کے باوجود معظم کے
بیان کی روانی، زبان کی چستی اور اسلوب کی شگفتگی میں کوئی فرق آتا ہے اور نہ کلک کا البیلا
اور تخیل کی ندرت متاثر ہوتی ہے۔

معظم نے بزرگان سلسلہ کی طرح میں شکوہ پیدا کرنے کے لیے الفاظ کا طلسم
باندھا ہے اور نہ صنائع بدائع کی مرصع کاری کا سہارا لیا ہے، بلکہ وہ ہر بزرگ کے کمالات
مقامات اور صفات عالیہ کی ایسی سچی اور حقیقی جاگتی تصویر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں
جس کا حسن صداقت مشاطگی کا حقدار نہیں ہوتا اور جو اپنے اچھوتے پن کی وجہ سے خود
پر خود دل میں اتر جاتا ہے۔

معظم کے سہل الممتنع اسلوب کا مطالعہ کرنے والا سرسری نظر میں ان کے سادہ و
پرکار فن کی عظمت کا اندازہ کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس لیے کہ یہ وہ فن ہے جو
بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن جس کا برتنا تمام اسالیب بیان سے زیادہ مشکل ہے۔

جب وہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتا ہے کہ معظم کے عہد میں زبان کسی تخلیقی دور سے
گزر رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی تخلیق کی وہ شوار گزار راہوں، ان کے بیچ و خم اور ان کے
تشیب و فراز سے گزر کر شاعر کے ذہنی سفر کا اندازہ کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقت آشکار
ہوتی ہے کہ یہ فن جو شیر لانے سے کم نہیں۔ اور یہ اسلوب خونِ جگر کی ایزانی کے بغیر
نصیب نہیں ہوتا۔

بزرگان سلسلہ کے حالات و واقعات اور روحانی کمالات تقدس اور احترام کے
نورانی بالے کے باوجود شاعری کا موضوع جیتے ہیں تو اپنی ساری آب و تاب کھودیتے ہیں
اور انتہائی خشک اور غیر دل چسپ معلوم ہونے لگتے ہیں لیکن معظم نے اس لیے اس
موضوع میں بھی جان ڈال دی ہے۔ اس مثنوی کی کامیابی میں جہاں معظم کے جذبات کے
خلوص، ان کے دل کے گہرا، ان کی طبیعت کی شگفتگی اور ان کی زبان کی لطافت کو
داخل ہے وہیں اس کی کامیابی میں ترکیب و تنظیم اور ترتیب و تسلسل کا بھی بڑا حصہ ہے۔
معظم کی تمام مثنویوں کا یہ امتیازی وصف ہے کہ موضوع کی نوعیت جو بھی ہو وہ نظم کی
رہیت اور فن کے تمام پہلوؤں پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان
کی ہر مثنوی میں آغاز، ارتقا اور اختتام کا وہ محسوس ہوتا ہے جو ہر کامیاب نظم کا فنی تقاضا
ہے۔ معظم کی منظومیت کا یہ وصف اس لیے بھی بہت زیادہ متاثر کرتا ہے کہ ان کے ہر شعر
صوفی شعر کا کلام اس سے عاری ہے۔

دیوانِ معظم

شاہ معظم شنوی نگار ہی نہیں غزل گو بھی تھے۔ انھوں نے غزلیات کا ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے۔ اُن کے ہم عصر غزل گو شعرا میں شاہی، نرقی، ہاشمی، شغلی اور ایامی قابل ذکر ہیں، لیکن ان میں سے صرف شغلی لے اور ہاشمی لے کے دیوان ملتے ہیں۔ شاہ معظم کے دیوان کے تین نسخے دست یاب ہوئے ہیں، جن میں سے ایک کتب خانہ نواب سالار جنگ میں، دوسرا کتب خانہ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی میں اور تیسرا ایک خانگی کتب خانے میں ہے۔

۱۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ، حیدرآباد

مخطوط نمبر (۹۱) دواوین (تعداد صفحات (۳۰)، تعداد غزلیات (۵۰) تقریباً یہ ایک ناقص الاول، ناقص الاوسط اور ناقص الآخر نسخہ ہے۔ بہ حالت موجودہ جو صفحات رہ گئے ہیں، اُن میں بھی ترتیب نہیں ہے۔ غالباً جلد بندی میں اوراق آگے پیچھے

۱۔ دیوان شغلی، احمد خاں صاحب درویش کو کہیں سے دست یاب ہوا تھا، جس کو راقم الحروف نے سرسری طور پر دیکھا ہے۔
۲۔ ہاشمی کا دیوان ڈاکٹر حفیظ قیصر نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔

برگئے ہیں، تاہم رکاب سے اُن کی ترتیب کا پتا چلایا جاسکتا ہے۔
اس نسخے میں صرف ردیف (ب، ت، ث، ق، ک، گ، ال، م اور ن کی غزلیں ہیں۔ ردیف (ک کی غزلوں کی تعداد زیادہ ہے، قصیدے، منقبت اور مدح کو بھی ردیف کے اعتبار سے شریک دیوان کیا گیا ہے۔

۲۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

مخطوط نمبر (۱۷) دواوین (تعداد صفحات (۱۰۰)، تعداد غزلیات (۲۸۶) تقریباً۔ یہ نسخہ بھی ناقص الاول و ناقص الآخر ہے۔ درمیان سے بھی کہیں کہیں صفحات غائب ہیں۔ اسے ی تک ہر ردیف میں غزلیں ہیں۔ اس نسخے میں بھی غزلوں کے ساتھ نعت، منقبت اور مدح وغیرہ شامل ہیں۔
دیوان کے خاتمے پر کسی شنوی کے (۳۶) صفحات ہیں، جن کا ذکر علاحدہ کیا جائے گا۔

۳۔ کتب خانہ سید سلطان محمدی الدین قادری

پہلے دو نسخوں کی طرح یہ نسخہ بھی نامکمل ہے، تاہم اسے ی تک ہر ردیف میں غزلیں ہیں۔ اس نسخے کے خاتمے پر بعض صوفیائے بیجاپور کے سنین وفات اور قطعات تاریخ درج ہیں۔ انھیں صفحات پر وہ قطعہ تاریخ وفات بھی ہے جو محمود خوش دہاں نے شاہ برہان الدین جانم کی وفات پر لکھا تھا۔ اس نسخے میں بھی نعت، منقبت اور مدح شامل ہیں۔

مشتاق لطفی اور شہباز یا ان میں سے کسی ایک کو بھی بہمنی دور کا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ تو کہنی غزل کا آغاز بہمنی دور میں ہو چکا تھا اور اگر یہ شاعر بعد کے دور سے تعلق رکھتے ہیں تو پھر غزلیں کوئی کے آغاز کا سہرا کول کنڈے کے سر بندھتا ہے اور بلا خیالی

محمود اور فیروز اس صنف کے ابتدائی دور کے شاعر مانے جائیں گے۔

محمود، خیالی اور فیروز کی استادی مسلم لیکن صنف غزل کا اعتبار محمد قلی قطب شاہ سے قائم ہوا، جس نے اپنی رنگینی، طبع، سرمستی شباب اور وارستگی حسن و عشق ہی کا نہیں اپنے عہد کی تہذیبی زندگی اور اپنے دور کے مخصوص جمالیاتی ذوق کا ترجمان بنا کر اُس کو نیا رنگ و آہنگ دیا، نئی وسعتوں اور رفعتوں سے آشنا کیا اور کیمیت و کیفیت ہر دو اعتبار سے اُس کا پلہ گراں کر دیا۔ وہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے اور اُس نے دیوان مرتبہ کر کے ایک ایسی روایت قائم کی جو غزل کی مقبولیت اور اُس کے روشن مستقبل کی ضمانت بنی۔

محمد قلی قطب شاہ کی پیروی میں غزل گوئی کا رجحان عام ہوا اور دیوان مرتبہ ہونے لگے۔ گیارہویں صدی اس صنف کو راس آئی۔ اب اُن کی لے دھیمی نہیں رہی تھی۔ مثنوی کی دھوم دھام کے باوجود اُس کے سراؤں نے ہو گئے تھے اور مثنوی کے مسلم الثبوت اساتذہ بھی، شہرت عام اور بقا سے دوام کا سامان فراہم کرنے کے باوجود، عورتوں سے باتیں کرنے اور عورتوں کی زبان میں باتیں کرنے کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ اگر لطفی اور شہباز کی ریختیاں بہمنی دور سے تعلق نہیں رکھتیں تو بھی یہی ریختیاں اس صنف کے اولین نمونے مانی جائیں گی۔ فرق صرف یہ ہو گا کہ انھیں بہمنی دور کی بجائے عادل شاہی دور کی پیداوار تسلیم کیا جائے گا۔ گول کنڈے کی ریختی کے اولین نمونے محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں ملتے ہیں۔ اس طرح دکن میں غزل اور ریختی کے دھارے ساتھ ساتھ

لے ڈاکٹر زور نے ان کا ذکر بہمنی دور میں کیا ہے (دکنی ادب کی تاریخ، صفحہ ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۲۵) سخاوت مرزا مشتاق اور لطفی کو بہمنی دور کے شاعر مانتے ہیں (قدیم اردو کی ایک نایاب بیامن، اردو، اکتوبر ۱۹۵۷ء) اور نصیر الدین ہاشمی نے بھی اُن کو بہمنی دور کے شعرا میں شامل کیا ہے (دکن میں اردو، چھٹی اشاعت، صفحہ ۴۴، ۴۷)

چلتے ہیں۔

بیجا پور میں غزل کی روایت دیر میں شروع ہوئی۔ محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر بیجا پوری حکمران ابراہیم عادل شاہ ثانی بھی شاعر تھا، لیکن یہ دونوں تاج دار شاعر دکنی ادب اور دکنی تہذیب کے دو علاحدہ دبستانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دبستانوں کے اسی اختلاف نے ہندو لمانیت کے علم بردار اور ہم عصر ہونے کے باوجود، ایک کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے گیت کی ہیئت اور دوسرے کو غزل کی صنف اختیار کرنے پر مجبور کیا، لیکن یہ دبستان دو ایسے دھارے نہیں تھے جو متوازی چل رہے ہوں۔ وہ ایک دوسرے سے متاثر ہوتے اور ایک دوسرے کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ عبداللہ قطب شاہ نے نورس کے جواب میں گیت لکھے اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور کے بعض شاعروں: فانی، مقیمی وغیرہ نے گول کنڈے کے شاعروں کی پیروی میں غزلیں کہیں۔ بعض محققین شہباز حسینی کو بھی اسی دور کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ محمد عادل شاہ کے عہد کے شاعروں میں ظہور، رستمی اور ملک خوشنود کی غزلیں ملتی ہیں۔ یہ بیجا پور میں غزل کا ابتدائی دور تھا۔ یہاں غزل گوئی کو فروغ دراصل علی عادل شاہ ثانی شاہی کے زمانے میں ہوا۔ نصر قی کاگل دستہ، کلیات شاہی، دیوان ہاشمی، دیوان شغلی اور دیوان معظم لک بھگ اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاہی کے کلیات میں صرف اُنہیں غزلیں ملتی ہیں، نصر قی کاگل دستہ ناپید ہے، اس لیے صاحب دیوان شاعر معظم، ہاشمی اور شغلی قرار پاتے ہیں۔

نظام شاہی سلطنت کی تباہی کے بعد حسن شوقی بیجا پور چلا آیا تھا۔ وہ مثنوی ہی کا نہیں غزل کا بھی بڑا شاعر تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی غزلوں کا دیوان مرتب

نہیں ہوا۔ اور اگر ہوا تو ہم تک نہیں پہنچا۔ اب تک اس کی صرف تیس غزلیات دست یابی ہوئی ہیں۔

شاہ معظم صاحب دیوان شاعر ہیں، لیکن اُن کے ہاں غزل کی وہ روایت نہیں ملتی جو محمد علی قطب شاہ سے ہوتی ہوئی، اُن کے معاصرین شاہی اور نفری تک پہنچی تھی اور جس میں حسن سے مراد جسم اور عشق سے مراد عیش کوشی تھی۔ چمکتے اور چمکتے جسموں کے اسرار اور کھل کھیلنے کے الطوار غزل کا محبوب موضوع تھے، اور ان کی نان ٹوٹی تھی۔

ترسے مرے پاؤں سکی جیوں ناگ ناگن مل رہے

یہ دربار کی روایت تھی، لیکن ایک اور روایت خانقاہ میں پروان چڑھ رہی تھی جو شاعر لطفی، اور شہباز سے ہوتی ہوئی معظم تک پہنچی اور مسایل و اصطلاحات سے گزر کر عشق کی آگ میں تپ کر کندہ بننے کے لیے سرانجام کی منتظر تھی۔ یہ خانقاہ کی روایت کا عبوری دور تھا اور شاہ معظم اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا حسن اور عشق کا تصور علوی ہے۔ وہ کائنات کے ذرے ذرے میں حسن ازل کو دیکھتے ہیں، عشق کو سر تخلیق مانتے ہیں، عرفان نفس کو عرفان ذات کا وسیلہ جانتے ہیں، اسی دنیا میں دیدار حق کے قائل ہیں،

وصل اُن کے نزدیک مَن و تو کے امتیاز اور اعتبار سے گزر جانے کا نام ہے، جس کے بعد نہ عبد رہتا ہے نہ معبود، نہ عاشق نہ معشوق، نہ محبت نہ محب نہ محبوب : بے مثل دو جہاں میں ہے یار کا جہاں : بے چوں و بے چگونہ، بے شبہ بے مثال گاہے سیماں ہوا ہیں، گاہے دیکھو بقیس ہو : کیا کیا مکر ظاہر کردوں، مکار اور عیار کا

لے مولوی عبدالحق نے دو (اردو بابت جولائی ۱۹۲۹ء) سخاوت مرزا لے تین (اردو بابت اپریل ۱۹۵۴ء) حسینی شاہ نے پانچ (قدیم اردو، جلد اول) بدیع حسینی نے دو (دکن میں ریختی کا ارتقا) اور جمیل جالبی نے سترو غزلوں کا پتہ چلایا ہے۔ یہ تمام غزلیں دیوان حسن شوقی، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی میں شامل ہیں۔

کی خلقت یو خالق نے مگر خود دیکھنے خاطر : کیلے عرش اور کرسی، دھرت اور لنگن پیدا محروم میں ازل سوں، ان کو تو بیچ دستا : ہور عاشقاں تو کہتے دستا ہے جگ اُجال میں تو سے جاگڑ تو وصلت اسے کہتے ہیں : اٹھ یاد اور ہر تو، عشرت اسے کہتے ہیں اس سر کی کر کے سیر می، بجلی سو چڑکے جاتو : عشاق سب کہتے ہیں دیدار بھاغ پانا کہ میں بچاں ہوا میر رام شہ کا کتا ہور، تاج کو : محل قرب کا عجب ہے جاگا صدر چڑے پر عبث اُڑنا منظم نے تصوف اور معرفت کے جن مسائل، موضوعات، نکات اور مقامات کی تشریح و تفہیم اپنی مختلف شنیوں میں کی ہے، اُن کا سرمایہ فکر و نظر اور حاصل عمر رواں ہے اور اسی کو انھوں نے غزل کے پانوں میں سمونے کی کوشش کی ہے :

ایمان سا جو ہر تچ پاس ہے امانت : رکھا نہیں جتن کر بھی تو رکھا سو کیا کر پیر کی پرستش دیکھا نہیں جو حق کو : رویت تو کچھ کھلا نہیں نعمت دیا سو کیا جس دُور نہیں خدا کا اور لاج نہیں پہنکی : اوفس کا ہے بندہ رو ہو ریا سو کیا ہے علم کا نہایت ہونا خدا سوں واصل : کبھی علم ہے پردا بھی تو سکیا سو کیا تر لوک کو زور دیا کہتے ہیں اپنے نور سوں : نور علی ہے نور اور معدن کسے انوار کا بیچ وقت کا عبادت کرتے ہیں زہد اہل : صوم و صلوات اپنا دائم دلام رکھنا تو شیخ میں نفی ہو، دیک شیخ میں نفی ہوا : تب پاسے گا دھنی سوں درجا بلال کا دیکھو بلال باگلی دیکھے نبی میں حق کو : تب عرش پر گزرتھا حضرت بلال کا اس چارتن سو مر مر باچے اگر کہ میں تو : تب تچ کو چٹ لگے گا مومن کے خیال کا ! یار کے دیدار کو فروس بھی زنداں کتے : یار کی درگاہ کو کہتے ہیں سب دارالسلام سرست لائابالی مجذوب کیوں ہوئے ہیں : دیکھے ہیں کچھ کہتے ہیں اس یار کا خیال مجھ یار بول کہنا راز و نیاز اپنا : ہے قال یو اسی کا میرا ہے کیا بجاں یہ تصوف کے مضامین و مسائل ہیں، جنہیں شاہ معظم منتر کی طرح دہراتے ہیں۔ ان

مسائل کی اپنی اہمیت ہے لیکن جب تک مسائل اور مضامین احساسات اور جذبات کے سانچوں میں نہیں ڈھل جاتے، اُن میں شدت، شوریدگی اور سپردگی نہیں پیدا ہوتی، — اور وہ حسن، شعریت اور تاثیر سے محروم رہتے ہیں۔ اس لیے شاہ معظم مسائل کی کھدائی کی بجائے واردات، کیفیات اور مکاشفات کی باز آفرینی سے کام لیتے تو زیادہ کامیاب ہوتے اور جہاں اُنھوں نے یہ رنگ اختیار کیا ہے کامیاب رہے ہیں۔ معظم ہر غزل کے مقطعے میں اپنے شیخ قادر کا ذکر التزام کے ساتھ کرتے ہیں اور بڑے پیار اور دلہانہ پن کے ساتھ کرتے ہیں۔ شیخ کا نام آتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی شخصیت کا ہر تار جھنجھٹا اٹھتا ہے :

دل برسوں مل معظم عشوت مدام کرو ۞ قادر ترا سنگاتی تیرے سنگا ہے لگ
 قادر سوں سچے معظم نا ہو جدا اتا تو ۞ دامن کوہات سٹ کر ہونا کتے ہیں ٹائل
 یوراز معظم بولا ہے اور موتی لاکر رولا ہے ۞ تب کلمہ لوس کا بولا ہے جب قادر اوس ہوشیار کیا
 بزرگی اسم اعظم کی کیا قرآن میں لیکن ۞ معظم کو مدد کرنے سو قادر نام خوش گستا
 اسے بادشاہ کشور تر ہے نام قادر ۞ مشتاق ہے معظم دے جام اور نولا
 ہوشیار ہو معظم، قادر صبا پوچھے گا ۞ مجربان بھی جہاں میں ناحق رہا سو کیا
 قادر تجھے مدد ہے کیا ڈر اتنا معظم ۞ ادیشٹ بلان کتے سو کرا ہے ہمارا
 ناحق معظم میک تو سپر ہے اس جنجال میں ۞ کی نعمت الوان شکر قادر سوں مل کھانا بھلا
 او بادشاہ خویاں قادر ہے نام اوس کا ۞ خلعت عطا کرے گا سن کر کلام میرا
 میرا معظم ناؤں رکھ عالم پو پو ظاہر کیا ۞ قادر بڑا داتا ہے پھر کیا کہے گا دیکھنا
 عشاق سب کتے ہیں اٹھ کچھ فکر کر ۞ قادر سوں مل معظم کلمہ کلام کرنا
 اگر مقطعوں کا یہ آہنگ اُن کی غزل گوئی کا آہنگ بن جاتا تو اُن کی غزل کے تیور
 ہی کچھ اور ہوتے۔

معظم طبعاً صوفی صافی تھے۔ وہ عاشق ہوئے بھی تو اپنے پیر کے عاشق ہوئے۔
 بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نہ اُنھیں حسن مجاز سے سابقہ پڑا تھا، جس کی رنگینیاں شعر
 کی فکر و نظر پر چھا جاتی ہیں اور نہ وہ اس عشق مجاز کے لذت چشیدہ تھے، جس کی جنوں
 سامانی خیر و شر کے بیانیوں کو ٹھکرا کر آگے بڑھ جاتی ہے اور گرمی گفتار بخشی ہے لیکن
 اُن کے ہاں مجازی حسن و عشق کے مضامین غمازی کرتے ہیں کہ وہ اس کو چے سے نا آشنا
 نہ تھے، البتہ وضع احتیاط کے تقاضوں نے مجاز کے واردات و تجربات کے اظہار پر
 پھرے چھا دیے تھے :

ترے یونین جادو گر کیے ہیں مجھ کو پڑ مردہ ۞ بچن مفر سوں چیتا ہوں، نہیں مجھ کام مریم کا
 دستا الف احد جیوں قامت ہمارے یار کا ۞ شیریں سخن اعجاز جیوں عیسیٰ نہیں دل دار کا
 دیکھو یک نام سوں جس کے موے سو پھر کے جیتے ۞ سو جیوں اعجاز عیسیٰ تھا سیٹھا گفتار یوں اچھا
 حرا و روشن یو عالم سب کتے ہیں جس کے پر تو مولا ۞ منور جیوں چندو اس کے کتے خساریوں اچھا
 دہن تنگ اور کمر نازک بدن نزل عجب خوش تر ۞ پریشاں زلف پر قند کتے عیار یوں اچھا
 نقاب زلف شکیں تو کرے جب دور کچھ رسوں ۞ او جالایل میں ہوتا ہے مجھ فرصت ہے اس دم کا
 کاکل کے پیچ اس کے کیا کم ہیں او بلا سوں ۞ میٹھے بچن بلا اور اس کا ادھر بلا
 یو دل مرا جھنور ہو لیدا ہے یار او پر ۞ اے یار تجھ گلے میں پھولوں کی دیکھ مالا
 کچھ رسوں کا ڈیرے زلف نقاب مشکیں ۞ پڑتا ہے دیکھ شبنم تو پھل رہا ہے لالا
 گلزار تجھ بدن کا سایہ ہے مے پینے کو ۞ شمشاد سو کہاں کم قامت تر ہے بالا
 اس رنگ کی ایک غزل میں بڑی دل چسپ تشبیہ استعمال کی ہے :

دل برکے کچھ اوپر کا لالا یو خال ج کو ۞ منجس میں جیوں نبی کے حبشی بلاں دستا
 لیکن حیرت ہوتی ہے کہ وہ شاہد مجاز کے خد و خال، ناز و ادا، جور و جفا کا ذکر کرتے
 کرتے یک لخت اپنے شیخ، یا کسی بزرگ سلسلہ یا خدا اور رسول کی طرف آجاتے

ہیں اور شاہ مجاز سے متعلق پچھلے اشعار میں وہ جو کچھ کہہ آئے ہیں، اُس کو اپنے شیخ، بزرگ
سلسلہ یا شاہ حقیقی سے منسوب کر دیتے ہیں اور پڑھنے والے کی عقل اس تضاد و اتحاد
کی بواجبی پر انگشت بہ دندان رہ جاتی ہے۔ مثلاً ذیل کے اشعار میں حضرت غوث الاعظم
کی مدح کے سلسلے میں حسن مجاز کے جن اوصاف سے اُن کو متصف کیا ہے، وہ محل نظر
بھی ہے اور موجب حیرانی بھی :

تیرا قدم کھاندے اوپر سارے ولی کرتے قبول

روشن منور نامور تو غوثِ صدیقی ہوا

تجہ حسن کا کر لے بیاں قدرت ہے کس انسان کو

تجہ لعل لب کے فیض میں، لعل، بخشائی ہوا

تجہ نین سوں نو گس ہوا اور زلف سوسنبل کتے

تیرے دکن کی جوت سوں یا قوت مر جانی ہوا

مشوق سچہ حق کا کتے قادر محی الدین ہے

والی معظم کا دیکھو او شاہ جیلانی ہوا

اسی طرح ایک غزل میں یارِ گل بدن، بادشاہِ حواہاں اور جرّہ لب کے ذکر کو اپنے

شیخِ قادر سے وابستہ کر دیا ہے :

اِس یارِ گل بدن کو بولو سلام میرا : بعد از کہو حقیقت سارا تمام میرا

اول او سے سرا کر بولو سب حقیقت : او داد گر ہے داو دے گا انعام میرا

امید وہ جہاں کا رکھتا ہوں میں اوسى سوں : اوس نام کا وظیفہ ہے صبح و شام میرا

ایمان سا جو اہر صدقہ کیا ہوں اوس پر : ہو جہاں نثار کرنا اکثر ہے کام میرا

یک جرّہ اپنے لب کا نا بھیجتا سبب کیا : میں عقل سوں پچھانا ہے عشقِ خام میرا

او بادشاہِ خواباں قادر : ہے نام اوس کا : خلعتِ عطا کرے گا سن کر کلام میرا

اِس سے زیادہ دل چسپ مقام وہ ہے، جہاں وہ اللہ تعالیٰ کے لیے گل بدن کی
اصطلاح استعمال کرتے ہیں :

اُس یارِ گل بدن کو بے چوں کتے سبب کیا : دستا چہ نہیں مثل اُس کے مثال کا

باچوں ہے روپ اُس کا بے چوں کتے سبب کیا : خورشید سوں منور اس کا مثال دستا

اُس گل بدن سوں لٹنے پیدا کرے وسیلہ : نہیں تو کتے میں ملنا اکثر محال دستا

اسی طرح مکار، عیار، پرز، پر بلا وغیرہ جیسے الفاظ، جو اردو غزل میں محبوب

کے لیے استعمال ہوتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ اور اپنے شیخ کے لیے بے تکلف استعمال کرتے

ہیں :

گاہے سیماں ہوا میں، گاہے دیکھو بقیس ہو : کیا کیا مکر ظاہر کروں، مکار اور عیار کا

قادر ہے نام جس کا پر فتہ پر بلا ہے : قامت علم قیامت بلا سوں بستر بلا راں

عارف کتے معظم کیوں کر پڑا بلا میں : مشہور ہے جہاں پر اُس کا مکر بلا

ہوا چوں یار میں اُس سوں دیکھیں پنج ڈرتا ہوں

سنیا ہوں واصلان سوں میں کتے اغیار قادر ہے

حقیقت اور مجاز کی یہ آنکھ جولی اور لفظی و معنوی یہ دورنگی اُن کی اکثر غزلوں میں ملتی

ہے اور اس کی وجہ یہ ظاہر معلوم ہوتی ہے کہ غزل کا سرمایہ لفظی و معنوی جو مجاز کے رنگ

میں رنگا ہوا ہے، غزل گو معظم کا دامن تھام لیتا ہے، لیکن شاہ معظم کا دلی اپنے پیر کے

ذکر اور حقیقت کے بیان سے منہ موڑنا نہیں چاہتا، جس کی وجہ سے اُن کی اکثر غزلیں شتر

گرگی کا شکار ہو کر رہ گئی ہیں۔ تاہم اُن کے ہاں ایسی غزلیں بھی مل جاتی ہیں جن میں اُن

کی فکر کا محور نہیں بدلتا اور حقیقت و مجاز دست و گریباں نظر نہیں آتے۔ ان غزلوں کا اپنا

آہنگ ہے، جن میں داخلیت کی دھیمی دھیمی آہنج اور لب و لہجہ کے گداز نے تیکھا پن

پیدا کر دیا ہے، لیکن یہ خصوصیات انھیں غزلوں میں پیدا ہو سکی ہیں، جن میں مسائل براہِ راست

نہیں آئے ہیں بلکہ تجویزے اور احساس کے سانچوں میں دھل گئے ہیں۔ ان غزلوں کی زبان بھی سادہ و پرکار ہے :

اسے دل تو اس دنیا میں آکر کیا سوکیا : کرنا سوتوں کیا نہیں لئی دن جیا سوکیا
آب حیات کہتے، دل برکے ہے ادھر میں : اوجام تجہ ملائیں بھی تو پیا سوکیا
جس پر لئی محبت اور چیز حق منگا ہے : پیارا تو جی ہے تن میں، بھی تول دیا سوکیا
دل پھاٹ پھوٹ تیرا کئی لخت ہو رہا ہے : سب تن جھجھ رہا ہے بھی تو سیا سوکیا

مقبول دو جہاں میں یک یار ہے ہمارا : معشوق ہوا ہر باں دل دار ہے ہمارا
آثار مجہ گئے میں رکھتا ہوں عاشقوں کا : ہر تار اوس زلف کا زنا رہے ہمارا

میرا تو دل برہان ہے پھر کیا کرے گا دیکھنا : اکثر مرا غم خوار ہے پھر کیا کرے گا دیکھنا
اس کر کے سکے بدل پھرتا ہے گوش را دن : ایسا او خود مکار ہے پھر کیا کرے گا دیکھنا

مجھ دل میں یو ہوس ہے دل بر کو پیار کرنا : ہو رکھ ادھر سوں اوس کے یہ جیون تار کرنا
یو عشق ناگ جس کو کاٹے اچھے کہے تو : کوی گا گڑبسی ملے تو بس کا اتاد کرنا

ہے عشق آگ کہتے کاں لگ چھپا رکھے گا : بہتر ہے راز اپنا سب خاص و عام کرنا
مج کو تو اس دنیا میں کیا خوب میخانہ دسیا

روشن، منور، بے بدل، نادر و یو خم خانہ دسیا
عشاق تو ماتے رختے دل دار کے دیدار میں

عارف اوسی کو جاننا جس بات پیادہ دسیا

دو جہاں سو رخ پھرا دل برسوں دل باندھا ہوں میں
تب عاشقاں کہتے مجھے تو ایک افسانہ دسیا

دل دار کے اس شہر کو جس دن مرا جانا ہوا
ترتیب الٹھا دیک کر بے ہوش دیوانا دسیا

اول سوں میں عاشق اتھا دل دار کے دیدار کا
پھر دیکھتے مجنوں کو جیوں لیسلا چہ کا بھانا ہوا

جب سوں مجالس یار کا بھر کر نظر دیکھا ہوں میں
تب سوں دیکھو سب عیش یو گج کوں تو افسانا ہوا

اظہار کیوں کروں میں یو راز دل ربا کا
مجھ پر ہے شرم غالب آتا ہے مج کو غیرت

یو عارفاں سمجھتے عاشق یو کیوں ہوا ہے
دستا ہے مجھ او پر سب یو عشق کا علامت

معشوق سوں ملے لگ عاشق کوں کاں صبر ہے
جو کوئی ہیں لا اوبالی کر تیج نہیں درنگ

شاہ معظم خریاتی شاعری کے بڑے دل دادہ ہیں۔ اردو کا پہلا ساقی نادر انھیں کے
زور قلم کا نتیجہ ہے جس پر پچھلے صفحات میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اُن کی اکثر غزلوں میں نئے و

مستی کے مضامین ملتے ہیں۔ بعض غزلیں تو پوری کی پوری خمریات سے تعلق رکھتی ہیں۔ جتنا کی لہک اور لب و لہجے کی کھٹک جس سے غزل میں لہجہ، گھلاوٹ اور نکھار پیدا ہوتا ہے، شاہ معظم کے مساکن و معارف میں ملتی ہے اور نہ شاہد مجاز کے ذکر میں، لیکن جہاں کہیں وہ اپنے شیخ یا شراب کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں تو ان کے اشعار میں غزل کا تب و تاب پیدا ہو جاتا ہے۔

مشرق طرف صبح کا دستا ہے دیک، اہالا : ساقی منگا تو بیگی رہ نعلی اور پیالا مشہور ہے روایت کہتے ہیں سب کالاس : ٹک بیگ اس پلانا جو کوئی نئی آتالا۔ اکٹار ویک سحر کا ہوشیار سب ہوئے ہیں : مرغاں چین کے سارے کرتے ہیں شور نالا اٹھ بیگ نے پلا کر سب دور کر خاری : اکثر شراب کہنہ دارو ہے بے مثالا مکھ پر سول کا ڈیرے زلف نقاب مشکیں : پڑتا ہے دیکھ شبنم تو پھل رہا ہے لالا گل زار تجر بدن کا سایہ ہے سے پینے کو : شمشاد سو کہاں کم قامت ترا ہے بالا

ایمان دے کتے ہیں کہنہ شراب پینا : دو چار جام پی کر وارو خمار کرنا آیا ہے پھر زمستان مل یار سوں پینا سے : اور دل کو اس چین کے تازہ بہار کرنا

ہوا ہے صبح کا ذب یو پلا مجہ جام اوجم کا : خاری دور کرتا ہو رہا ا ہے کتے غم کا یہ کہہ عذر اسے دل بڑنٹ عاجز ہوا ہوں میں : پلا مجہ بات سوں اپنے قدح بھر آب زم زم کا عجائب وقت ہے ساقی نہ ہو تو نیند کے درپے : دیکھو لالے کے پھولوں پر رہا ہے بوند شبنم کا سچیں خمار دنیا کا کیا ہے مجھ کو سرگرداں : وادام جام دے کر مجھ اٹھاوے نقش تاقم کا ان اشعار میں شاہ معظم نے جس شراب کا ذکر کیا ہے، وہ شراب معرفت نہیں بلکہ خالص افشہ الگور ہے :

جنت سے کہاں ہے یو جام ارغوانی : خالص شراب لا کر تجہات سوں پلانا انھوں نے ساقی نامے میں بھی اسی سے مجاز کی آرزو کی ہے اور وہ اس کی مستی کو بے خودی خود فراموشی اور خدا یا بی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ شرعی نقطہ نظر سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی سے مجاز کی یہ افادیت شبہ سے خالی نہیں ہے، لیکن جو شاعر شیخ کو مکار، عیار، فتنہ اور ہلا کر سکتا ہے اگر وہ شراب حقیقی کو افشہ الگور پر محمول کرتا ہے تو تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ بہر صورت یہ اشعار خمریات، مستی، اور ذوق مستی کی کامیاب ترجمانی کرتے ہیں۔

شاہ معظم کے دیوان میں قابل لحاظ تعداد میں ریختیاں بھی شامل ہیں یہی ریختیاں ان کے دیوان کی جان ہیں۔ شاہ معظم صاحب دیوان شاعر ہیں، لیکن ان کی غزل، بحیثیت مجموعی، تغزل اور اس کے رچاؤ سے عاری ہوتی ہے اور کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ صنف نازک کے عطائے شعلہ و شرر کا تجربہ رکھتے تھے۔ ان کے ہاں وہ کرب و اضطراب بھی نہیں ملتا جس کے بغیر عشق مجاز کامیاب ہوتا ہے اور نہ عشق حقیقی، لیکن ان کی ریختیاں کامطالعہ کیجیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کی شخصیت ہی بدل گئی ہے۔ ان کی ریختیوں کا اپنا ایک رنگ اور آہنگ ہے، جو ان کے پیش روؤں اور معاصرین دونوں سے مختلف ہے۔ ان کا تابا با حقیقت اور مجاز کے تار حیر دو رنگ سے تیار کیا گیا ہے اور ارضیت اور علویت کی دھوپ چھاؤں نے ان میں نرمی اور گرمی، رنگ اور کرس نور اور سرور، کیف و مستی، سپردگی اور گداز خلی کی وہ کیفیات پیدا کر دی ہیں، جو ہندی کے کرشن بھکت، شاعروں کے مادھو یا بھاؤ اور واپستہ بھکتی کے لیے مخصوص سمجھے جاتی ہیں، اور جو بھوگی اور بھوگی دونوں کی ذہنی، جذباتی اور روحانی آسودگی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

دکھن میں غزل اور ریختی کا آغاز ساتھ ساتھ ہوا۔ عورت کی طرف سے یا عورت کی

زبان میں اظہارِ محبت کی روایت غزل اور رباعی دونوں سے پرانی ہے۔ اس روایت کے فروغ کے دو اسباب ہیں۔ ایک سبب تو ہندی فلسفہ اور بھکتی شاعری کا اثر ہے۔ ساکبہ ورشن میں پرش اور پرکرتی کا یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ پرش (وجود حقیقی) ساری کائنات کی اصل ہے، جس نے اپنے آپ کو روح اور مادے میں تقسیم کر دیا۔ روح کا کام مادے کی تسخیر ہے، جس سے زندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ روح کی صفت فعالیت ہے اور مادے کی انفعالییت۔ اس لیے روح کو پرش (مرد) کے روپ میں اور مادے (کائنات) جس میں تمام انسان بھی شامل ہیں) کو عورت کے روپ میں سمجھا گیا ہے۔ بھاگوت میں اس نقطہ نظر کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ اس میں کرشن کے روپ میں پرماٹما کی اور گویوں کے روپ میں تمام انسانی روجوں کی تشبیل پیش کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھکت، بھگوان کو پرش (مرد) ملان کر خود استری (عورت) کے روپ میں بھکتی کرتے ہیں۔ کرشن بھکت شاعروں نے اس روایت کو بڑا فروغ دیا۔ انھیں کے توسط سے یہ روایت دکن میں پہنچی۔ دوسرے یہ کہ خود مونیہ ہندے کی انفعالییت اور شاہد حقیقی کی فعالیت کو تسلیم کرتے تھے اور انھیں جہتوں کو نمایاں کرنے کے لیے، اپنے لیے تائیت اور محبوب حقیقی کے لیے تذکر کے سیئے لاتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر حفیظ قتیل کہتے ہیں :

زندگی میں غالب اور مغلوب، محتاج اور محتاج الیہ، عامل اور معمول، صانع اور مصنوع اور مرد اور عورت میں جو فاعل اور منفعل کی نسبت ہے کچھ ایسی ہی نسبت مرید کو شیخ کے ساتھ، بندے کو اللہ کے ساتھ ہوتی ہے، ہندی فلسفے میں اسی نسبت کو منش اور پرکرتی کی نسبت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی لیے میرا باقی نے بنارس کے برہمنوں سے کہا تھا کہ مرد تو صرف ایک

۱۔ راجیشور پرشاد چترودی، رباعی کالین کوٹا، صفحہ ۱۱۵، بحوالہ بدیع حسینی، دکنی رباعی کا ارتقا، صفحہ ۸۰۔
۲۔ رام تن بھٹناگر ہندی کا بھکتی کا دیہ، صفحہ ۲۰۵، بحوالہ بدیع حسینی، دکنی رباعی کا ارتقا، صفحہ ۸۱۔

کرشن ہے اور باقی سب عورتیں ہیں، یعنی دینے والا صرف کرشن ہے، جن میں فعالیت ہے اور لینے والا مرد ہو یا عورت اس میں انفعال ہے، اس لیے وہ عورت ہے۔ مرید کی شیخ کے ساتھ اور بندے کی اللہ کے ساتھ اس نسبت کے پیش نظر صوفی شعرا نے عورت کی زبان اختیار کی۔

اس طرح عورتوں کی زبان میں نظموں اور گیتوں کے لکھنے کی روایت شروع ہوئی، پھر رباعیاں کہی جانے لگیں۔ دکنی میں یہ روایت چار مرحلوں یا دوروں سے گزری ہے۔ پہلا دور وہ ہے جب کہ انفعال، اسما اور صفات کی تائیت کے علاوہ عورتوں کی زبان کی کوئی خصوصیت نہیں ملتی۔ دوسرے دور میں عورتوں کے محاورے کے علاوہ ان کی زبان کی بعض اور خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ لطفی اور شہباز اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں، تیسرے دور میں عورتوں کی زبان، لب و لہجہ اور محاورے کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ موضوعات عام غزل ہی کے ہیں لیکن جنسی رویے، محالطت عشق اور زیب و زینت کی اشیاء وغیرہ کے ذکر سے رباعی کی ایک مخصوص فضا پیدا ہو گئی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے ہاں یہ رنگ بہت گہرا ہے۔ وہ غزل میں کھل کھلتا ہے، محالطت کا اظہار بر ملا کرتا ہے، وصل کے ہر لمحے کے مرتعے بڑے شوخ رنگوں میں کھینچتا ہے، لیکن رباعی میں وضع احتیاط کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اس کی وجہ یہ ظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنی پیاریوں کے جذبات کا احترام کرتا ہے، اور جانتا ہے کہ جو کچھ وہ خود غزل میں کہتا رہا ہے اگر رباعی میں اپنی پیاریوں کی زبان سے کہلائے گا تو پیاری اور میسوا میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔ یہی رنگ بحیثیت مجموعی شاہی تک گول کندہ اور بیجا پور میں رائج رہا۔ چوتھا دور ہاشمی بیجا پوری کا ہے، جس نے رباعی کو ایک مستقل اور منفرد صنف سخن کی حیثیت سے برتا اور اس کو معراج کمال پر پہنچایا۔ اس کے ہاں عورتوں کی زبان کا ہر روپ، ان کا لب و لہجہ، ان کے روز مرے،

۱۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل، دکن میں رباعی کا ارتقا، مشمولہ مجلہ عثمانیہ، دکنی ادب نمبر، صفحہ ۱۲۴۔

محاورے، کہاوتیں، ضرب الامثال، کوسنے، دعائیں، بددعائیں، عقاید، توہمات، ٹونگے، رسومات، اُن کا طرزِ اظہار، طرزِ فکر اور طرزِ زندگی، اُن کے لباس، زیور، آرائشِ زیبائش کے ساز و سامان کی جو تفصیل ملتی ہے وہ اس سے پہلے کہیں نظر نہیں آتی۔ وہ فائقہ یا محلاقی ریختی کا شاعر نہیں ہے۔ عوامی ریختی کا شاعر ہے۔ اس لیے اُس کا ذخیرہ الفاظ بھی وسیع ہے اور موضوعات اور مسائل میں رنگارنگی، تنوع اور وسعت ملتی ہے۔ اس کے ہاں ہر مزاج، ہر عمر اور ہر طبقہ کی عورت کی ازواجی اور جنسی زندگی کے نشیب و فراز ہی نہیں ہیں، بلکہ سماجی زندگی کے وہ حرکات بھی ہیں جو ازواجی اور جنسی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ اس کے ہاں عاشقانہ فاسقانہ اور فاحشانہ تینوں رنگ ملتے ہیں۔ آخری رنگ وہی ہے جو بعد میں ریختی کی انحصارِ خاصیت سمجھا جانے لگا۔ مختصراً، بقول ڈاکٹر حفیظ قنیل، جو شاعری بعد کو ریختی کے نام سے موسوم ہوئی اُس کے تمام خطوط ہاشمی کے زمانے میں متعین ہو چکے تھے اور خود ہاشمی نے اس شاعری کی نوک پلک کو اس قدر درست کیا تھا کہ رنگین اور جان صاحب لکھنؤ کے نئے ماحول اور نئی شعری روایات کے ساتھ بھی اس میں مشکل ہی سے کوئی نیا پہلو نکال سکے اور جوئے پہلو اُنھوں نے نکالے اُن میں ہم صنفی کی لعنت قابلِ ذکر ہے، جس سے ہاشمی کا دامن پاک ہے۔

شاہِ معظم، ہاشمی کے ہم عصر تھے، لیکن ان کو فغانہ کی روایت ورثے میں ملی تھی، اس لیے فاسقانہ اور فاحشانہ مضامین کی اُن کی ریختی میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ اپنے پیر کے عاشق تھے اور اُنھوں نے اپنی جہتِ فعالیت اور پیر کی جہتِ فعالیت کے اظہار کے لیے عورت کی زبان اختیار کی تھی۔ کرشن بھکتی کی شاعری اُن کے سامنے تھی جس کا مادہ یا جھل اور داپستہ بھکتی کے مزاج اور مسلک کے عین مطابق تھے۔ اُن کے بزرگ سلسلہ شاہ برہان الدین جانی نے یہ کہہ کر اُن کے لیے راہیں ہموار کر دی تھیں۔

لہ ڈاکٹر حفیظ قنیل، دکن میں ریختی کا ارتقا، شمول جملہ عثمانیہ، دکنی ادب نمبر، صفحہ ۱۲۱

یوشام سلونا توں میرا رے
نہ چلے تجھ پر مشتہ ٹونا رے
جو کہے چاہے سرفانی ہونا رے

فغانی الشیخ کے لیے اور کیا چاہیے تھا، اس نے اپنے عشق اور واردات اور کیفیت کے اظہار کے لیے ریختی کی صنف کا انتخاب کیا اور صوفیائے متقدمین کی طرح صرف اسرارِ افعال اور صفات کی تانیث پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عورتوں کی زبان، روزمرے اور محاورے اُن کی مخصوص نغظیات، سہاگن، کالی پوت، ابرن، پان، بیرے، مالا، پھولوں کے ہار، ہسی، سہیلے، بدائی، سکھی بھی استعمال کیں، جس کی وجہ سے اس کی ریختی زبان، اظہار اور اسلوب کے اعتبار سے ہاشمی کی ریختی سے ٹکر لیتی ہے۔ ہاشمی کو اپنی سلاست پر بڑا ناز تھا لیکن معظم کی زبان سلاست، روانی، شائستگی اور وقار میں ہاشمی سے بڑھی ہوئی ہے۔ معظم کی ریختی ان کے پیر کے گرد گھومتی ہے، وہی اُن کے موہن، لال، پیو، پیا، پیارے، دو لہا، سرینج اور سیج کے سنگاتی ہیں اور وہی اُن کے شہ اور شہنشاہ۔ اُنھیں کو معظم رجھاتے، مناتے، اکساتے ہیں، اُنھیں سے شکوہ و شکایت کرتے ہیں، اُنھیں کو ہرجائی کا طعن دیتے ہیں، اُنھیں کے لیے پان کے بیڑوں، پھولوں کے ہاروں، بارخ کے میوؤں کا اہتمام کرتے ہیں، اُنھیں کے لیے سہیلے گاتے ہیں اور سیج سنوارتے ہیں۔ اُنھیں پر اپنی جوانی اور دین و ایمان بچھا درتے ہیں۔

اُن کی ریختی کی عورت پر کیا (ایسی عورت جو پرارے مرد سے پوشیدہ طور پر محبت کرتی ہے) نہیں سو کیا (یتی ورتا) ہے۔ یہی مرید صادق اور فغانی الشیخ کی خصوصیت ہے۔ اس لیے وہ ہاشمی کی عورت سے مختلف ہے۔ یہاں تا ناک جھانک ہے نہ چما چاٹی، نہ جو بن پہ بات ہے اور نہ مقصود کو انپڑنے کے لیے بے دھرمک ہونے

کا جذبہ، نہ دانی کا کھٹکا ہے نہ ساس نندوں کا خوف، نہ فحاشی ہے اور نہ عریانی، نہ
جنسی تلذذ ہے نہ کھل کھیلنے کے ارمان، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ "ایک سہاگنی
کے مختلف جذبات ... اور ایک نیک شعار عورت کے نسوانی جذبات کی ترجمانی
کی ہے۔" اور یہ بھی اس لیے کہ: بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کبے بغیر۔

پیارے کیوں کرم کر کر آتا مجھ گھر میں آتے ہیں
وگر نہیں تو اپس منہ رکھیں مجھ کوں باتے ہیں
دریغاً مجھ کوں آتا ہے شرط کر قول کیوں بسرے
آتا تو خواب میں ہرگز سینے سوں مجھ کو لاتے ہیں
اول کیوں چاؤ سوں مجھ کوں اپنے اہرن پنا تے تھے
آنا کیوں ہار چھوڑوں کے گلے میں لیا کو بھاتے ہیں
تمہیں ساتی مجالس میں سدا خواباں کے ہوتے ہیں
وصل کا جام کوئی بھر کر مبارک لا پلاتے ہیں
اس حسرت سوں رورور سینا چھوٹا ہے سب میرا
اپس دل راز کیاں باتاں آیتا اگر سناتے ہیں
تمہیں میں صاحبِ عالم تمہارا نادوں قادر شہ
مرے سر پر قدم رکھ کر ضیافت کھا کے جاتے ہیں

اتھی نادان تب لگ میں پیا تمنا نہ جانی میں
آتا چھند پند یو سارے تارے سب پھانی میں

تمہیں یو بار با کہتے جو کچھ چہتا سو کرتا ہوں
سنی میں کان سوں اپنے ہوی تب سوں سیانی میں
تمارے نین جادو گر کیے کچھ سحر میرے پر
مٹھیاں باتاں تارے سے ہوی ہوں لب دیوانی میں
اول کیوں راز سب ذاتی سورجی مجھ سوں کہتے تھے
ملیاں ہیں نئی سکیاں تمنا آتا ہوی ہوں بیگانی میں
تمہیں میں حسن کے عاشق آتا میں خوب بھی ہوں
جلگ کچھ حسن تھا مجھ پر اتھی تب لگ بیگانی میں
تمہیں میں عشق لانے سوں ہوی رسوا دو عالم میں
تصدق سب تارے پر کیتی ساری جوانی میں
تمہیں عارفِ قدرواں ہیں کتے تمنا کوں قادر شاہ
کتی ہوں یو تارے سوں سنو جی کی کہانی میں

پیارے کی جدائی سوں مجھے گھر دار نہیں بھاتا
نہ مجھ کو کام خوش گلتا سگل سنار میں بھاتا
مجھے اہرن پہننے سوں سینے میں آگ لگتی ہے
لگانا تن کو خوش بو اور چھوڑوں کا ہار میں بھاتا
رکھی ہوں پوت کالی میں نشانی ہے سہاگنی کی
مستی داتوں کو لانا اور یو کچھ سنگار میں بھاتا
نویلا لال قادر شاہ سنگاتی سیج کا میری
کیا ہے مجھ سوں اغیاری کسی کا پیار میں بھاتا

مبارزینے کوں تیرے پر سہیلیاں یوں کھڑیاں رہنکیاں
 نیٹ توں لاج چھوڑی ہے بجرکی ہے تری چھاتی
 سکیاں سب سات کیاں تیرے ہیں گھر کھیلے اگر
 ابھائی کون ہے ایسی تجھے بد چال سکلاتی
 یو بجلیاں کا چمکنا ہونہ برسناتس پر سادن کا
 اندھارے گھر منے تج کوں اکیلے نیند کیوں آتی
 اتا اٹھ سات چل میرے مبادا دیں نکلے گا
 اجالا پل میں ہوتا ہے عبث یوں بار کیوں لاتی
 کتنی ہوں بات ہٹ کی ہیں یوں دل کے کان سوسن لے
 نہ کہ کچھ مان ایسے سوں او تیرے سیج کا ساتی
 کہ میں او سیج میں اپنے بلاوے تج کوں قادر شاہ
 تو اٹھ کر جواب دے بیگی نہ ہو تو نیند کی ماتی

اے دھن سکھیں چھوڑ ہٹ، آیا برش کالاکتے
 دستا ہے سب دون چہ ہو، بھر کر ندی نالاکتے
 بجلیاں چمکتیاں دیکھ کر رستی ہے کیوں ناداں توں
 دھاراں ہوتا راں کے نمں جگ بھر پڑیا جالاکتے
 بجھتی عبث ہے ہٹ بھری سایہ ستے دل دار کے
 شمس او سوں کچھ کم نہیں او سرو قد بالاکتے
 پڑتے ہیں بوہد شبنم نمں چند رہے بھیج کے اے سکی !
 منے پی کے ہونا سرخو ہوہر باندنا والا کتے

مجھے بھیجا ہے موہن نے پیاری تجھ بلانے کوں
 شہنشاہ آج چہتا ہے ادھر امرت پلانے کوں
 مبارک دیں آیا ہے، عبث توں آج رستی ہے
 سکیاں مشتاق ہیں ساریاں تجھے شہ سوں ملانے کوں
 اکیلی تجھ کوں دیکھے سو کیا ہے غم نے پڑ مردہ
 میما ہو کے آیا ہے پیارا تجھ جلانے کوں
 ہوا ہے مشورت سارا ترے مہراج دینا کر
 لیجا کر چاد سوں سب مل تجھے خلعت دلانے کوں

سحر اور مکر جادو کر کیے ہیں مجھ کو دیوانی
 شکایت جس کی کرتی ہوں وہی عیار یاد آیا
 پھر کہتیاں ہیں انکیاں میری سگنی ہوتی ہے ملنے کی
 سر بجن آج غور سوں مجھے کئی بار یاد آیا

معظم غزلوں کے ہر مقطعے میں اپنا تخلص اور اپنے پیر کا نام التزام کے ساتھ
 لاتے ہیں، لیکن ریختیوں کے مقطعوں میں اپنا تخلص نہیں لاتے بلکہ صرف پیر کا نام لاتے
 ہیں اور ان کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ ریختی میں عورت کی طرف سے بیان کیے
 گئے تمام جزئیات و معاملات قادر ہی سے متعلق ہیں؛
 تمہیں عارف قدرداں ہیں کتے تمنا کوں قادر شاہ
 کتنی ہوں یو تہارے سوں سونجی کی کہانی میں

نویلا لال قادر شاہ سنگاتی سیج کا میرے
 کیا ہے مجھ سو اغیاری کسی کا پیار میں بھاتا
 نویلا لال قادر شاہ مرے گھر آپ آیا کہ
 اتنا زہرہ سوں ہل ل کر منگل شہ پر پلاقی ہوں
 تمیں ہیں صاحب عالم، تمہارا ناؤں قادر شاہ
 مرے سر پر قدم رکھ کر ضیافت کھا کے جلتے ہیں
 کدھیں اویسیج میں اپنے بلاؤں سے توج قادر شاہ
 تو اٹھ کر جواب دے بیگی نہ ہو تو غیند کی ماتی
 ہوا ہے غم تو سرکش لئی مرا حافی ہے قادر شاہ
 مدد اگر غم خوار یاد آیا
 بعض ریختیوں میں وہ پہلے شعر ہی سے اپنے شیخ کو مخاطب کرتے ہیں :
 میں اپنے گھر شہنشاہ کوں اتنا نس دن پلاقی ہوں
 بلا کر چاد سوں شہ کوں ادھر امرت پلاقی ہوں
 اتنا دل کے صدر پر میں لیجا کر بیٹھلا شہ کوں
 کتک المان نعمت لیا پیارے کوں کھلاقی ہوں
 کدھیں شہ شوق کرتا یو چمن میں سیر کرنے کوں
 میں اپنے تن کے جھولے میں سر بجن کو سلاقی ہوں
 قدم مجھ سر پر رکھ کر امیں شہ چل کے آیا ہے
 گرد میں پاؤں کے شہ کی اپس ہاتھوں دھلاقی ہوں
 ضیافت شہ کی کرتی ہوں مرا میں جان صدقہ کر
 مرے کچھ باغ کا میوہ قدر واد کوں کھلاقی ہوں

نویلا لال قادر شاہ مرے گھر آپ آیا کہ
 اتنا زہرہ سوں ہل ل کر منگل شہ پر پلاقی ہوں
 بلائے اس شہنشاہ کوں اتنا مہمان منگتی ہوں
 تصدق اس آپ کرنے مرا میں جان منگتی ہوں
 مری ہے آرزو دل میں ضیافت یو چہ کرتی ہوں
 برابر شہ سوں ہل ل کر دکھانے پان منگتی ہوں
 بجز ویدار کیا کرنا مجھے فردوس ہو رگلشن
 سہیلے شہ پہ گاکا کر درس کا دان منگتی ہوں
 مبارک دیس آیا ہے جہاں میں عید نوروزی
 مرا انعام ہو ر خلعت کتک عنوان منگتی ہوں
 مرے کچھ باغ کا میوہ نذر شہ کوں کروں گی
 رچھا کر اس سور بجن کوں کنچن کا کھان منگتی ہوں
 نویلا لال قادر شاہ اودے گا داد سب میرا
 اسی کا پیار بس مجھ کوں، یہی احسان منگتی ہوں
 معظم کی ریختی میں جذبات کی گرمی۔ احساسات کی لطافت، سینے کا گداز اور
 لب و لہجہ کی وہ داخلیت ملتی ہے جس سے ان کی غزل بحیثیت مجموعی محروم ہے۔
 سادگی، سلاست، روانی اور رچاؤ کے ساتھ شائستگی، پاکیزگی اور رکھ رکھاؤ نے
 اس میں وہ انفرادیت پیدا کر دی ہے جو کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتی۔ اُن کی ریختی نہ
 محض قلمی قطب شاہ کی ریختی ہے اور نہ ہاشمی بیجا پوری کی، بلکہ اس کا اپنا ایک مستقل
 اور منفرد رنگ ہے اور وہ اس رنگ کے بڑے شاعر ہیں۔
 ڈاکٹر حفیظ قلیل نے صوفیاء ریختیوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ صوفیاء

ریختیوں کے ان نمونوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس صنف سخن کا آغاز اپنے اندر کس مذہبی اصلاح کی عظمت اور روحانیت کی پاکیزگی رکھتا ہے، مگر اس کو کیا کیجیے کہ ارتقا کے آخری روپ میں یہ پارسا بیسواہن بیٹھی۔ لیکن شاہ معظم کی ریختی پر یہ الزام عاید نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے خانقاہ کی روایت پر آج آنے نہیں دی۔

شاہ معظم نے غزل کی ہیئت میں نعت، منقبت اور مدح بھی کہی ہے، یہ سب چیزیں باعتبار ودیف دیوان میں شامل ہیں، نعت کا وہی آہنگ ہے جو کہیں ارض ہوا کہیں فلک تکتے، کیوں انس ہوا کہیں ملک کتے والی غزل کا ہے،

یوں اپنا اس کوں راج دیا، لولاک کبرا سرتاج دیا

سب امت کی ادلاج دیا، یوں جتنا اُس پر پیار کیا

حق مانگا خلقت کرنے کوں اور نعمت لا کر دھرنے کوں

اس دین کو قائم کرنے کوں، یو مظہر دیک انوار کیا

ادراک، عقل، عرفان دیا، فرمان اسے قراں دیا

سب دھیان دیا اور گیان دیا، یوں حق اس چوں سا دیا

بے عیب دیکھو وہ ظاہر ہے، اس کشف دلوں کا ظاہر ہے

سب راز رمز سوں ماہر ہے، تب محرم اُس اسرار کیا

کیا ناؤں مبارک سرور ہے، بیچ حق کا تو وہ دل بر ہے

راہ راست دکھانے رہبر ہے، تب علم لدنی بار کیا

حضرت علی اور حضرت امین کی منقبتیں زیادہ ہیں۔ دوسری منقبتوں میں حضرت

غوث اعظم، قطب زماں، حضرت قادر لنگا اور حضرت علی پیر کی منقبتیں قابل ذکر ہیں۔

ایک منقبت مختلف اولیا کے متعلق ہے۔ بادشاہوں میں صرف عالم گری کی مدح کی ہے۔

چند نمونے درج ذیل ہیں:

مشکل کشا تو حیدر یا مظہر العجائب ✦ شافع تو روز عشر یا مظہر العجائب

کر مدح تو علی کا حق کے اتا دلی کا ✦ شاہ سبحلی کا یا مظہر العجائب

گنج خفی نبی کا ہے تو وصی نبی کا ✦ برحق انجی نبی کا یا مظہر العجائب

اپنا نبی وصی کر، سر پر دھریں اپنی اختر ✦ صاحب تو ہفت کشو یا مظہر العجائب

کچھ چاند سوں نور، معدن تو نور اور ✦ ہے تاج توں میسر یا مظہر العجائب

مظہر ہوا عجائب، قدرت منہ غراب ✦ ہے توں نبی کا نائب یا مظہر العجائب

اے صاحب قطب الزماں سایہ ہے توائف کا ✦ اور قرۃ العین نبی مقبول توں درگاہ کا

افسر جو تیرے سرا پر خورشید سوں برتر دے ✦ مشتاق سب عالم ہوا دیک درس تجو نوہ کا

احوال سب اظہار ہے تیری شجاعت کا دیکھو ✦ یا عقل ہے یا فہم ہے یا سرا ہے آگاہ کا

تیرا ثنا اور صفت سن میرا غزل اور شعر یو ✦ سارے ملک از بر کریں یو مدح شاہنشاہ کا

اے صاحب قطب الزماں سایہ ہے تو سبھاں کا ✦ مالک ہے سچ کلون و مکاں پیارا ہے تو رحمان کا

نس دن ثنا خوانی ترا کرتا ہوں میں یو جان کر ✦ تو شافع روز جزا، دے دان مجھ ایمان کا

مشتاق سو ہے مجھ اوپر تجھ شاہ کا لطف و کرم ✦ بندہ ہوں میں اس روز سوں تجھ شکر اور احسان کا

جن و ملائک رات دن عاجز ہیں تیرے وصف میں ✦ تیرا مدح کرنے کیتیں کیا ہے، سکت انسان کا

قادر تجھے میں جان کر کرتا ہوں سر صدقہ مرا ✦ اے شاہ معظم کو اتا سلطان کر گن گیان کا

یکایک اس منجاس میں دیکھو دل بر ہوا پیدا ✦ سرا سر روپ بدلا کر امیں سرور ہوا پیدا

دنیا کے عیش میں پر کر دیکھو سب ہوش برسین ✦ وہی چہ راہ دکھلانے امیں رہبر ہوا پیدا

مرامکتوب سن کر یوحنا توچہ کہتے ہیں : عجائب آج دکھن میں شعر خوشتر ہوا پیدا ۔

دکھن اور پرموہر ہاں بھیجا ہے حق نے قدرواں : عالم پہ ہے اس کی بنا، یوسف کے من بھایا امیں
وحدت کیرے میدان میں کرتا ہے جولا شوق سوں : سر پر میداں کے ترے، تیرا چہ ہے سایا امیں
شاہ پور، بیجا پور جوں بھر پور ہے تجہ نور سوں : یوسب جہاں روشن ہوا تجہ سوشرف پایا امیں
تیر لال کسوت میں بدن دستا شفق میں چاند جوں : گویا ازل سوں نور کا تجہ پر بند فچھایا امیں

مشہور دو جہاں میں برتر ہوا امیں : خورشید سوں خور منظر ہوا امیں
دیکھو مرید شہ کے کیا قرب دار سے : سچہ حق ادوں کے اُپر یار ہوا امیں
شہ کے فقیر دیکھو کہتے خدا نا امیں : وحدت کے بحر کا چہ شستا در ہوا امیں

مجھے اس دین دنیا میں وہی یک یار قادر ہے : مرا سچہ یار ہو یا وہی دل دار قادر ہے
انکھیاں سوں بھانکنا میری زباں سو بولتا اپنی : جو کچھ دستا تو میرا میں یوسب آثار قادر ہے
اتنا چند روز سوں مجھ کو دیکھو مشرق تے مغرب لگ : ہر یک یک ٹھار دستا مجھ یوسب آثار قادر ہے
یو باتاں گنج مخفی کیاں کیا سب بول عالم پر : نہیں اصراف کچھ میرا یوسب اسرار قادر ہے

منور دو عالم علی پیر ہے : سچا پیر ہے ہور سچا میر ہے
وہ برحق نبی کا دسیا جانشین : علی کا یو فرزند گھنیر ہے
اسم با مسمیٰ ہے شاہ کا : دیکھو یوچہ دکھن کوں سب دھیر ہے
اپنی سلامت توں رکھ شاہ کوں : جلک یوز میں پور زماں تھیر ہے

حق کے کرم اور رحم سوں چھتر ہے عالم گیر کا : پر تو نبی کے نور سوں انبر ہے عالم گیر کا
برحق ولی پور بادشاہ کہتے جسے ظل الر : مرج ... فلک نو کر ہے عالم گیر کا
جس پر کرم خواجہ کیے برحق اوزندہ پیر ہے : ہر ٹھار پر اندا ہیں رہبر ہے عالم گیر کا
بیچ وقت کبھے منے کرتا ہے وہ جا کر نماز : قرآن کہتے رات دن دل بر ہے عالم گیر کا

شاہ معظم کو زہف زبان اور بیان پر ہی قدرت حاصل تھی بلکہ اُن کو فن پر بھی بڑی دست
تھی اُن کے دیوان میں کم و بیش وہ تمام بحر میں ملتی ہیں جو مزاج اور آہنگ کے اعتبار سے
صنف غزل سے مناسبت رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے بعض تجربے بھی کیے ہیں۔
مثلاً:

عارف کتے معظم کیوں کر پڑا بلا میں : مشہور ہے جہاں پر اُس کا مکر بلا
ہو شیار ہو معظم قادر صبا پوچھے گا : مجھ باج بھی جہاں میں نائق میا تو کیا
مشتوق سوں ملے لگ عاشق کو کلاں ہیر ہے : بے کوی ہیں لا ابالی کر تیر نہیں درنگ
مندرج بالا غزلیں بحر مضارع مثنوی میں ہیں، لیکن معظم نے ان غزلوں کے
ثنائی مصرعوں میں آخری رکن کو سالم کی بجائے محذوف (فاعلن) کر دیا ہے۔ اس طرح ان
غزلوں کا وزن یوں ہو گا:

مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن

مصرع ثانی مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن

گویا معظم نے بحر مضارع میں ایک نئے آہنگ کا اضافہ کیا ہے۔ اس آہنگ سے ان
کی بعض غزلوں کا معنوی حسن چمک اٹھا ہے۔

انھوں نے مودود اور غیر مودود دونوں قسم کی زمینیں استعمال کی ہیں، قافیہ
اور ردیف کی خوش آہنگی کا، بالعموم، اہتمام کیا ہے اور دیکھانا، بہانا، لالا، بالا :

زنار، دل دار، دیا، لیا، جانا، پانا، دم، غم، رخسار، گفتار، جاہ، گاہ، جلال، جمال، جیسے مترنم قوافی برتے ہیں۔ قوافی کے تعلق سے اُن کا یہ وصف خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتا ہے کہ اُن میں ایک یا ایک سے زیادہ حروف علت ملیں گے۔ جس قافیہ میں حرف علت نہیں ہوتا وہ غزل میں ثقیل اور ناخوش گوار محسوس ہوتا ہے۔ شاہ معظم نے اس ثقالت اور ناخوش گوار آہنگ کو روا نہیں رکھا ہے۔ فن کا یہ وہ نازک پہلو ہے، جس کا اہتمام معظم کے اعلیٰ ذوق پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے دستا، آیا، کرنا، تھا، کا، لگ، جیسی مختصر ردیفیں استعمال کی ہیں۔ ردیف کے تعلق سے معظم کے شعور فن کا اندازہ اُن غزلوں سے ہوتا ہے، جن میں انھوں نے ایسی ردیفیں استعمال کی ہیں، جو اپنے اندر برمی تجویزیت رکھتی ہیں۔ مثلاً،

اے دل تو اس دنیا میں اگر کیا سو کیا : کرنا سوں توں کیا نہیں لمی دن جیسا سو کیا
عجائب آج کی شب تھی سجن چو نہ راکھا تھا : مرے دل کے دلا سے کو ایس دل دار آیا تھا
مرا تو دل بریار ہے پھر کیا کرے گا دیکھنا : اکثر مرا غم خوار ہے پھر کیا کرے گا دیکھنا
مل یار سوں پینا سے باقی حیات ہے لگ : پینا بھی اور پلانا ساتی یوسات ہے لگ
پیارے کی جلدی سوں مجھے گھر دار نہیں بھاتا : نہ مجھ کو کام خوش لگتا، سگل سنار نہیں بھاتا
مجھے دل برکے لب سوں نت پینا جم جام خوش لگتا : پھر ٹنا مجھ کوں بھاتا نہیں وصل آرام خوش لگتا
اس طرح کی بلونی ہوئی ردیفیں خود غزل کے داخلی لہجے کا تعین کر دیتی ہے اور شعر کا لفظی و معنوی حسن چمک اٹھتا ہے۔

شاہ معظم اگرچہ صنائع بدائع کے دل دادہ نہیں معلوم ہوتے لیکن جہاں کہیں انھوں نے ان سے کام لیا ہے، نکھرے ہوئے فنی شعور، خوش مذاقی اور قادر کلائی کا ثبوت دیا ہے۔ خصوصاً ترصیح اور مسط کے برتنے کا انھیں بڑا سلیقہ تھا موخر الذکر کی کئی مثالیں ملاحظہ ہوں :

کیں ارض ہوا، کیں فلک کتے، کیں انس ہوا، کیں ملک کتے
یو دستا اس کا جھلک کتے، اس فور کا سب سنار کیا
کیں نبی ہوا، کیں علی کتے، کیں قطب ہوا کیوں دلی کتے
کیں خفی کتے، کیں جلی کتے، یو معنا اپر م پار کیا
کیں ندر ہوا، کیں پرک کتے، کیں دانا کیوں مرک کتے
کیں ہندو اور کیں ترک کتے، یو دو جگ پر بار کیا
کیں عاشق کیں معشوق کتے، کیں خالق کیوں مخلوق کتے
کیں منصور، کیں مفتوح کتے، سب چو کا چار کیا

یوں اپنا اُس کوں راج دیا، لولاک کیرا سرتاج دیا
سب امت کی اولاج دیا، یوں جتنا اُس پر پیار کیا
حق مانگا خلقت کرنے کوں اور نعمت لا کر دھرنے کوں
اس دین کو قائم کرنے کوں، یو مظہر دیک انوار کیا
اوراک، عقل، عرفان دیا، فرمان اُسے قران دیا
سب دھیان دیا اور گیان دیا، یوں حق اُس چو سنار کیا
کیا ناتوں مبارک سرور ہے، سچ حق کا تو وہ دل بر ہے
راہ راست دکھانے رہبر ہے، تب علم لدنی بار کیا
یہ صنعت دکنی شعرا میں بہت مقبول رہی ہے۔

شرح شکارنامہ

حضرت خواجہ بندہ نواز کے فارسی رسائل کا ایک مجموعہ حافظ سید عطا حسین صاحب نے "مجموعہ یازدہ رسائل" کے نام سے سلسلہ مطبوعات کتب خانہ روضتین، گل برگہ شریف کے تحت شائع کیا تھا، جس میں "برہان العاشقین المعروف بقصد چہار برادر و مشہور بہ شکارنامہ" بھی شامل ہے۔ یہ رسالہ جس کی حیثیت ایک معصی سی ہے، صوفیہ کرام میں بے حد مقبول رہا ہے اور اس کی مختصر و طویل متعدد شرحیں لکھی گئیں، تاکہ اُن مسائل اور مطالب کی وضاحت ہو سکے جو اپنی انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ "مجموعہ یازدہ رسائل" میں برہان العاشقین کے متن کے ساتھ سات شرحیں بھی شامل ہیں، جن میں سے چھ اکابرین سلف کے قلم سے نکلی ہیں اور ایک حکیم مرزا قاسم علی بیگ کا نتیجہ فکر ہے۔ ان اکابرین میں حضرت ابوہریرہ محمد عرف شیخ حسن محمد ششتی (متوفی ۹۸۲ھ ہجری) میر سید عبدالواحد بکراہی (متوفی ۱۰۱۰ھ ہجری) حضرت میر سید محمد کالپی، مولانا محمد رفیع الدین محدث دہلوی کے علاوہ وہ ایسے بزرگ ہجری ہیں جن کے ناموں کا پتہ چل نہ سکا، لیکن ان کے بارے میں یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ ۱۰۲۸ھ ہجری سے پہلے گزرے ہیں۔ ان میں سے ایک شارح کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ غالباً مخدوم سید اکبر حسینی فرزند اکبر حضرت بندہ نواز ہوں گے۔

دکھنی شکارنامہ حضرت بندہ نواز کے رسالے برہان العاشقین کا ترجمہ ہے، لیکن قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ترجمہ خود حضرت بندہ نواز نے فرمایا ہے، جیسا کہ بعض حضرات کا قیاس ہے، یا فارسی رسالے کی مقبولیت کے پیش نظر بعد کو کسی اور نے دکھنی میں ترجمہ کر دیا، تاکہ وہ لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکیں جو فارسی کی استعداد نہیں رکھتے۔ چوں کہ رسالہ بنیادی طور پر حضرت بندہ نواز ہی کا تھا، اس لیے ممکن ہے کہ دکھنی کے مترجم نے اس کو اپنے نام سے منسوب کرنا سوء ادب تصور کر کے ترجمہ کو بھی حضرت بندہ نواز ہی سے منسوب کر دیا ہو یا پھر بعد کو نقل کرنے والوں نے اس خیال سے کہ فارسی کی طرح دکھنی ترجمہ بھی بندہ نواز ہی کا ہوگا، دکھنی ترجمہ پر بھی حضرت بندہ نواز کا نام لکھ دیا ہو اور یہی نام چل پڑا ہو۔

فارسی کی طرح دکھنی میں بھی شکارنامہ کی کئی شرحیں لکھی گئی ہوں گی، لیکن ان میں سے ایک شکارنامے کا جزو لاینفک بن گئی ہے چنانچہ شکارنامے کے جتنے نسخے کتب خانوں اور خانگی ذخیروں میں دیکھنے میں آئے ہیں، ان سب میں یہ شرح موجود ہے۔ اور اس طرح لکھی گئی ہے کہ بہ ظاہر اصل متن کا جزو معلوم ہوتی ہے۔ دکھنی شکارنامے کے ترجمہ کی طرح دکھنی شرح کے شارح کا بھی پتا نہیں چلتا۔

شکارنامہ مع شرح مختلف رسائل تصوف کے ساتھ بمبئی اور مدراس سے کئی بار چھپ چکا ہے، لیکن دکھنی کے محققین نے اس کی طرف ۱۹۶۲ء میں توجہ کی اور عجیب اتفاق ہے کہ اس سال سید مبارز الدین اور ڈاکٹر ثمنیہ شوکت نے اس رسالے کو طویل مقدور کے ساتھ بیک وقت شائع کیا۔ ان دونوں نے بھی شکارنامے کے مصنف اور حضرت بندہ نواز سے اس رسالے کے انتساب کا کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا ہے بلکہ ڈاکٹر ثمنیہ شوکت نے تو اس مسئلے کو چھڑنے تک کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ اسی طرح شرح کے مصنف کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا گیا ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ دکنی ترجمے اور شرح کا مصنف ایک ہی ہوگا۔ تبھی شرح، ترجمے کا جزو لاینفک بنی رہی ہے اور مترجم اور شارح حضرت امین یا انھیں کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ ترجمے کا رنگ اور شرح کی تفصیل اسی خانوادے کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ چنانچہ شکارنامے سے ملحقہ شرح اور شاہ معظم کی زیر قلم شرح کا آہنگ اختلاف تشریح کے باوجود ایک ہی ہے۔

شاہ معظم کی شرح کا ایک ہی نسخہ (۷۱۱۷ء) کتب خانہ آصفیہ میں دست یافتہ ہوا ہے۔ اس مجموعہ رسائل کا ذکر جس میں شرح شکارنامہ شامل ہے، ہاشمی صاحب کی فہرست میں نہیں ہے۔ میرے کرم فرما مولوی احمد رضا صاحب درویش نے سب سے پہلے اس کا پتا چلایا اور اس سے مجھے واقف کرایا۔ لیکن یہ معلومات کتاب میں شامل ہونے سے پہلے ہی اسی عام ہوئیں کہ مولوی ہاشمی صاحب مرحوم نے رسالہ پونم میں ایک مختصر نوٹ شائع کر دیا اور ابو نصر محمد خالیدی صاحب نے پونم کے حوالے کے بغیر رسالہ قدیم اردو میں ان معلومات کو دہرا دینا ضروری سمجھا۔

شاہ معظم کی اس شرح کی اہمیت یہ ہے کہ یہ شارح کے نام کے تعین کے ساتھ ملتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ یہ شرح ناقص الآخر ہے اور غالباً موجودہ متن میں بھی دو ایک جگہ درمیان سے کچھ الفاظ اور چند جملے ساقط ہو گئے ہیں۔

شرح کے آغاز سے پہلے معظم نے لکھا ہے :

”اس شکارنامہ کا شرح فقیر حقیر محمد حسینی معظم قادری اپنے حوصلے موافق فرمائے ہیں۔“

اس وضاحت سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہم شاہ معظم کے نام سے واقف ہو سکے۔ نام کے اظہار کے بعد وہ شکارنامے کی شرح لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہیں۔

”اس واسطے کہ جو عاجز اس گھر چشت میں طالب ہوا ہے پورا امین الدین

علی خود کون سجدہ کیا ہے۔ اون کے تصدق سوں یو فقیر اس راز کو پوچھا ہے“ اس تمہید کے بعد شاہ معظم شرح کا آغاز کچھ اس طرح کرتے ہیں جیسے دکنی شکارنامہ جس کی وہ شرح لکھ رہے ہیں، حضرت بندہ نواز ہی کی تصنیف ہے :

”نو باپ یعنی حضرت خواجہ حسینی گیسو دراز قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں“ لیکن معظم کے متذکرہ بالا بیان کو بھی اس دعوے کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا کہ دکنی شکارنامہ بندہ نواز ہی کی تصنیف ہے۔ اس لیے کہ فارسی متن بندہ نواز ہی کا ہے۔ نفس متن ہو یا اس کا ترجمہ، جب بھی ان مسائل کا ذکر آئے گا جو شکارنامے میں بیان کئے گئے ہیں حضرت بندہ نواز ہی کا نام لیا جائے گا۔ معظم چون کہ شکارنامے کے انھیں مسائل کی تشریح کر رہے ہیں اس لیے لازمی طور پر حضرت بندہ نواز ہی کا نام لیں گے۔ اس لیے شرح کے سلسلے میں بندہ نواز کا نام لینے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دکنی ترجمہ بھی بندہ نواز ہی کا ہے۔

شرح کا آغاز کرتے ہوئے معظم نے نو بابوں اور سات ماؤں کی جو تشریح کی ہے وہ ان کی جدیت طبع کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ تشریح شکارنامے سے ملحقہ شرح میں موجود ہے، البتہ چار فرزندوں کی تشریح، انھوں نے چار مراتب وجود سے کی ہے۔ اس کے برخلاف ملحقہ شرح میں چار فرزندوں سے چار نفس (امارہ، لوازم، مطمئنہ، اور ملہم) مراد لیے گئے ہیں۔ چون کہ معظم نے اس تشریح میں اپنے لیے علاحدہ راستہ نکالا ہے، اس لیے وہ اپنے خیال کی تائید میں شاہ برہان کا حوالہ دیتے ہیں۔

حضرت قدس سرہ قطب الاقطاب شاہ برہان صاحب یوں فرماتے ہیں :

”اس وجود کا محل یعنی پیدا بھی ہوا یہاں نہ ہو رہنگا بی یہاں نہ۔“

پھر ان چاروں فرزندوں کو چار بھائی قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں :

”چور چارہ بھائی سوا لازم الوجود (عالم شہادت کا وجود جس کے لیے خانوادہ

امینیہ میں واجب الوجود کی اصطلاح عام طور پر استعمال ہوتی ہے) مکن الوجود۔“

اس سلسلے کی مزید تشریح بھی شاہ معظم کی اپنی ہے،

”ہر تین بھائی ننگے تھے یعنی انوکو وجود نہ تھے جو نظر کی قید میں آویں۔

ہر ایک بھائی کپڑے پہنائے سو یہ وجود فوٹھا رہا تھا۔ ہر اوس

آستین میں پیکے تھے یعنی خدا کی محبت ہر عشق اوس وجود میں ہے۔“

البتہ یا زار کی پیچس جنسوں کی تشریح معظم اسی طرح کرتے ہیں، جس کی مراحت لمحہ

شرح میں ہے۔

لمحہ شرح میں چار کمانوں کی تشریح خاک، پانی، باد اور آتش سے کی گئی ہے اس کے

برخلاف معظم ان چار کمانوں کو شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت سے تعبیر کرتے ہیں

اور ان چار منازل کی چار شہادتوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔

لمحہ شرح میں چار تیروں کی مراحت روح ملکوتی، روح قدسی، روح سفلی، اور

روح علوی سے کی گئی ہے، لیکن معظم ان سے مراد ذکر جلی، ذکر قلبی، ذکر روحی اور ذکر ربی

لیتے ہیں۔

لمحہ شرح میں چار ہرنوں کی شرح اس طرح کی گئی ہے،

”اول ہرن تن فنا یعنی وجود محوی، دوسرا ہرن تن کثیف یعنی محمودی، تیسرا

ہرن تن بقا یعنی احمدی، تین ہرن موے، چوتھا ہرن تن لطیف یعنی احد ذات

حق ہے۔ سبے چون دبے چگونہ۔“

معظم کی شرح حسب ذیل ہے،

چار ہرن سو چار نفس ہیں سو، نفس مطمئنہ، نفس ملہمہ، نفس لوانہ، نفس امارہ

انوکوں زہر کرتا سو عقل قیاس عقل گمان، عقل وہم، عقل آگاہ۔“

اس کے بعد شکار نامے میں ہرن کے شکار اور اس کے باندھنے کے لیے چار رسیوں

کا ذکر ہے۔ معظم کی شرح میں اس مقام کی تشریح نہیں ہے۔ اس کے بعد چار گھروں کا ذکر

ہے۔ لمحہ شرح میں ان چار گھروں کو شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت ٹھہرایا ہے

لیکن معظم کے ہاں صرف ایک ہی گھر کا ذکر ملتا ہے، جس کے ساتھ ہی انھوں نے محراب

کی تشریح شروع کر دی ہے۔ گھر اور محراب دونوں کی تشریح لمحہ شرح سے مختلف ہے۔

لمحہ شرح میں محراب کو حقیقت کا محراب اور قبولیت کا محراب کہا گیا ہے، لیکن معظم

کہتے ہیں،

”ہر خاکی گھر سو یو ہوا جسے قلعہ بولتے ہیں۔ ہر محراب سو یون واجب الوجود۔

خداے تعالیٰ نے قرآن میں در سورہ نور خبر دیا ہے، اللہ نور السموات والارض۔

ہر دل سو حقیقت، جسے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے عرش اللہ تعالیٰ“

معظم کی شرح یہاں ختم ہو جاتی ہے۔

معظم کی اس شرح سے ان کے تبحر علمی، کمال فن اور قوت اجتہاد کا اندازہ ہوتا ہے،

اپنی شرح میں انھوں نے لمحہ شرح سے قدم قدم پر اختلاف کیا ہے اور اپنے لیے الگ

راہ نکالی ہے۔ ان کی شرح ان فارسی شروح سے بھی مختلف ہے جو ”یازدہ رسائل“

میں شامل ہیں۔

QASID KITAB GHAR

Mohammad Hanif Razvi Nagarchi
Near Jamia Masjid, Arcot Dargah,
BIJAPUR-586104, (Karnataka)

مثنوی

شاہ معظم کے دیوان مخزونہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ (نمبر مخطوط ۱۷ دوادین) کے خاتمے پر ایک ناقص الطرفین مثنوی کے (۳۶) صفحات محفوظ رہ گئے ہیں، جن کے ابیات کی مجموعی تعداد کم و بیش (۲۹۸) ہے۔ چونکہ مثنوی ناقص الطرفین ہے اس لیے پتا نہیں کہ اس کا نام کیا ہے اور وہ کتنے صفحات اور ابیات پر مشتمل تھی۔ قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس مثنوی کے مصنف شاہ معظم ہی ہیں۔ اس لیے کہ کوئی داخلی یا خارجی شہادت ایسی دست یاب نہ ہو سکی، جس سے مصنف کے تعین میں مدد ملتی ہو۔ مثنوی دیوان کے خاتمے پر نقل کی گئی ہے، اس لیے قرینہ اسی کا ہے کہ یہ شاہ معظم ہی کی تصنیف ہوگی۔ لیکن یہ قرینہ بھی کم زور ہو جاتا ہے، جب آخری صفحے پر حسب ذیل شعر لکھے ہیں۔

کیا ہے نام میرا لال مشہور : مرا سینا ہے اب لگ داغ ساں
مرا والد زمرہ شاہ ہے گا : عدالت کے فلک کا ماہ ہے گا
شعر ہا جہ کی مثنوی لال و گہر کے ہیں۔

لے یہ مصرع اصل میں یوں ہے :
”مرا سینا ہے اصلاً داغ سے دور“

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث مثنوی کے ساتھ دو ایک صفحات مثنوی لال و گہر کے بھی شیرازہ بند ہو گئے ہیں۔ ان صفحات کو جوہر سے مثنوی زیر بحث بھی مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس کا ذکر مشتبہات کے تحت کیا جا رہا ہے۔

زیر نظر مثنوی ناقص اور نامکمل ہونے کے باوجود زور بیان، ندرت الفاظ، اسلوب نگارش اور بلندی تخیل کی وجہ سے کسی بڑے شاعر کا کارنامہ معلوم ہوتی ہے شاہ معظم بنیادی طور پر ایک صوفی شاعر ہیں اور انھوں نے اپنی منظومات میں خانوادہ امینیہ کی تعلیمات ہی کو نظم کیا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ خانوادہ امینیہ کے شعرا میں ممتاز نظر آتے ہیں۔

اس مثنوی میں شاعر نے ایک مثال پیش کیا ہے اور مجرد تصورات کو کرداروں کا روپ عطا کر کے سب رس اور سب رس سے مستفاد مثنویوں کی طرح ایک دل چسپ قصے کو شاعرانہ انداز اور تکیہ اسلوب میں بیان کیا ہے۔ پوری مثنوی کا خاکہ ہمارے سامنے نہیں ہے، اس لیے اس کی ہیئت، موضوع اور مضامین کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے، تاہم حسب ذیل مریخوں سے کسی حد تک رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

- ♦ جنگ عشق و عقل با ہم ظفر یافتن عشق۔
- ♦ مصاحب کردن عشق جنوں را و دیوانہ شدن و سر پر صحر ازدن۔
- ♦ فرستادن حسن رحم را و آمدن عشق بر شہر و بہ جام رفتن و مئے نوشیدن۔
- ♦ نامہ نوشتن عشق بہ حسن و جواب نامہ نوشتن حسن بہ عشق۔
- ♦ رقعہ خواستگاری نوشتن عشق بہ عصمت بی بی مادر حسن۔
- ♦ عروسی عشق و حسن و کیفیت عروسی۔

مثنوی کا اسلوب بیان وہی ہے جو وہجی نے سب رس میں اختیار کیا ہے۔ جس طرح وہجی نے حسن، دل، عشق، عقل وغیرہ کو کرداروں کا روپ دے کر ان کے عمل سے قصے کا تانا بانا تیار کیا ہے، اسی طرح اس مثنوی میں بھی عشق، عقل، حسن، جنون اور عصمت وغیرہ کو کرداروں کی حیثیت دے کر ان کے عمل سے قصے کا بیرنگ تیار کیا گیا ہے، اگر یہ پوری مثنوی دست یاب ہوتی تو یقیناً دکنی شاعری میں ایک کامیاب مثنوی کا اضافہ ہوتا، لیکن افسوس ہے کہ تلاش کے باوجود کسی کتب خانے یا خانگی ذخیرے میں اس کے کسی دوسرے نسخے کا پتہ نہ چل سکا۔

مولوی عبدالحق نے اپنے مضمون "سب رس" میں لکھا ہے کہ دکن کے چار شاعروں نے بھی اس قصے کو اپنی زبان میں بیان کیا اور چاروں منظوم ہیں۔ ان میں ایک شاہ حسین ذوقی ہیں۔ جن کی نظم کا نام دھمال العاشقین ہے اور سند تصنیف سنہ ۱۰۸۶ ہجری میں گلشن حسن و دل کے نام سے اس قصے پر استاد شاہ غفری ہیں جنہوں نے سنہ ۱۰۸۶ ہجری میں گلشن حسن و دل کے نام سے اس قصے کو نظم کا جامہ پہنایا ہے اور تیسرے سید محمد دل اللہ قادری ہیں جن کی نظم کا عنوان "سب رس" ہے۔ چوتھے شاعر کے نام کا پتہ نہ چل سکا۔ مثنوی کا نام "حسن و دل" ہے۔ اس کے دو نسخے مولوی صاحب مرحوم کے یہاں تھے لیکن یہ دونوں ناقص ہیں۔

مولوی صاحب نے تینوں مثنویوں کے نمونے بھی نقل کیے ہیں اور دھمال العاشقین مصنفہ سید شاہ حسین ذوقی اور گلشن حسن و دل مصنفہ غفری پر علاحدہ مضامین بھی لکھے ہیں لیکن آخری مثنوی کا کوئی نمونہ نہیں دیا ہے، ممکن ہے کہ یہ زیر نظر مثنوی ہی کا دوسرا نسخہ ہو۔

اس ناقص الطریق مثنوی کا آغاز حسب ذیل اشعار سے ہوتا ہے۔

۱۔ مولوی عبدالحق، رسالہ اردو، بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۲ء

۲۔ مولوی عبدالحق، رسالہ اردو، بابت ماہ جولائی ۱۹۲۵ء

زبس دو مضامین منور رسا ۛ نقشہ میں بھتر سوں دو یا ہر دسا
جب اس نے دہن کھول تعلق کیا ۛ اپس کون خوش آہنگ بلسل کیا
خوش اندام حق نے بنایا او سے ۛ نزاکت کے کپڑے پنہایا اسے
شراب اس میں تھا شربت گیان کا ۛ عرق تھا دو یا قوت کے کھان کا
اس کے بعد جنگ عشق و عقل باہم نظر یافتن عشق کی سرخی کے تحت عقل کی بڑائی کی
ہے اور پھر عقل اور عشق کی معرکہ آرائی کا ذکر چھیڑا ہے۔ عقل کے متعلق ابتدا میں جن
خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بڑے بلیغ اور فلسفیانہ ہیں اور یہ خیالات اقبال کے تصور
عقل سے اس قدر قریب ہیں کہ اقبال کے حسب ذیل شعر کی تفسیر معلوم ہوتے ہیں۔
عقل گو آستان سے دور نہیں ۛ اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دکنی شاعر کہتا ہے:

عقل جس سوں پاتے ہنساں تیز ۛ اگرچہ بڑی چیز ہے اسے عزیز
وہی گھر منے معرفت کا دیوا ۛ عقل خود شناسی کوں لازم ہوا
کہ تا خوب سمجھے کہ ہوں کون میں ۛ کہاں سوچل آیا ہوں دنیا کیستیں
بزاں ہو کے آیا ہوں کس کام سوں ۛ کہاں بھاں سو جاؤں گا انجام کوں
دلے عقل اکثر دیکھا یوں کیا ۛ کہ میں اس کے میں عشق او پر دیا
عقل بڑی چیز ہے۔ اسی سے انسان میں تیز اور خود شناسی پیدا ہوتی ہے معرفت کے
گھر میں وہ ایک روشن چراغ ہے۔ وہی انسان کو اپنے متعلق ان بنیادی سوالات کے
جواب کی تلاش پر مجبور کرتی ہے جو آغاز آفرینش سے آج تک اس کو پریشان کیے
ہوئے ہیں، یعنی میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کیوں آیا ہوں؟ اور کہاں جانے والا
ہوں؟

ان خیالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر عام صوفیاء کے برخلاف عقل و شعور کی

کار فرمائی اور معرفت حق کی راہ میں اس کی رہنمائی اور افادیت کے تعلق سے کس قدر متوازن رائے رکھتا ہے، لیکن اقبال کی طرح اس کو بھی اعتراف ہے کہ عقل کے پاس عشق کا دیا نہیں ہے۔ اس لیے اس کی تلک و دو ایک خاص مقام پر رک جاتی ہے۔ اس کے آگے اس کو کچھ سمجھائی نہیں دیتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عقل کو عشق کے جوارغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاہ معظم نے "گفتار عقل و عشق" میں عقل کی فضیلت اور اہمیت کو تسلیم کیا ہے لیکن زیر نظر اشعار میں شاعر کا نقطہ نظر زیادہ واضح اور فلسفیانہ ہے۔

عقل کی بڑائی کرنے کے بعد عقل اور عشق کی ازلی آویزش کی طرف اشارہ کیا ہے:

اندیشے کے فوجاں بھجاتا ہے نت ۛ جنوں کا منافع کہواتا ہے نت
عشق میں ہے آفت و وفاد خراب ۛ عشق کا جگر اوس کے ہاتھں کباب
دلے عشق کی قدر دھرتا نہیں ۛ عشق کے جنوں کن ٹھہرتا نہیں
اس کے بعد عقل اور عشق کی محرکہ آرائی کا نقشہ کھینچا ہے۔ کہتا ہے کہ جب عقل کو معلوم ہوا کہ حسن اور عشق رنگ رلیاں منارہے ہیں تو اس کے دل پر سانپ لوٹ گیا اور اس نے رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے عشق پر فوج کشی کا ارادہ کیا۔ سپاہ دار لشکر اور محاسب دفتر کو طلب کر کے ایک بڑا لشکر تیار کرنے کا حکم دیا۔ سپہ دار لشکر کا نام اندیشہ اور اس کے بیٹے کا نام و سواکس ہے،

فوج کی ترتیب کا ذکر اس طرح کرتا ہے،

عقل آپ تھا قلب لشکر میں ۛ ہراول کیا ہوش مرزا اُنے
طرف راست تھا فہم خان دلیر ۛ طرف چپ تھا دانش آقا شیر
خواست ملک بھی چند لاول ہوا ۛ اسی قسم لشکر مکمل ہوا
چلا یوں عقل حیرت آباد کوں ۛ چڑھا عشق اور فوج بیدار کوں
عشق کو اس بلائے ناگہانی کی خبر نہ تھی اور وہ حسن کے ساتھ داد عیش دے رہا تھا۔

صبح سویرے جب مرغِ بسل سحر نے نالے کے پر کھولے، سورج کا رنگین پھول روشن ہوا۔ پھولوں کے دل باغ باغ ہو گئے، آسماں نے رات کی زلفیں سمیٹیں اور ساری دنیا نور میں نہا گئی تو خیال نے عشق کے ہاں جاسوس روانہ کیا اور اطلاع دی کہ یہ دن رات کا عیش و عشرت کب تک عقل ہمارے ملک پر چڑھا آیا ہے۔ جنگ کی تیاری ضروری ہے۔ عشق کو اس آفت ناگہانی کی اطلاع ملی تو غصے سے سرخ ہو گیا۔ لشکر کو تیاری کا حکم دیا، حسن کو بھیگی نظروں سے وداغ کیا اور کمر ہمت باندھ کر سپہ دار لشکر جنوں خاں شیر کے ساتھ حیرت آباد سے روانہ ہوا۔ ہراول کی کمان بے خودی بیگ کے ہاتھ میں تھی۔ مینے کی رہنمائی مسرت آقا کے ذمے تھی اور میسرہ درو بیگ کے تحت تھا۔

بالآخر عقل اور عشق کی فوجوں کا آمناسا منا ہوا۔ بڑے معرکے کا رن پڑا۔ گرد و غبار کا یہ عالم تھا کہ آسماں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سیاہ بادل چھا گئے ہیں۔ اس تاریکی میں تلواریں بجلی کی طرح چمکتی تھیں۔ ہر طرف خون کی ندیاں بہ رہی تھیں اور ان میں انسانی جسم تیرتے پھرتے تھے۔ موت، مراسیمہ اور حیران تھی۔ نقارے زندگی پر قائم کر رہے تھے۔ غرض ایک قیامت برپا تھی۔

یہ ایک عقل کی فوج منتشر ہونے لگی، بے خودی نے جب ہلکا کیا تو سپہ دار عقل اندیشہ وادیا کرنے لگا، ہوش مرزا بھاگ کھڑا ہوا، فہم خاں اور فراست ملک کا کہیں پتا نہ تھا۔

غرض عقل بھاگا بے حال سوں ۛ عشق فتح پایا ہے اقبال سوں
متذکرہ بالا جائزے سے شنوی کے ایک مرقعے کے خط و خال اجاگر ہو جاتے ہیں، جو بڑے نیکیہ ہیں۔ ان چند اشعار سے بھی شنوی کی اٹھان کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے دوسرے عنوانات کا تفصیلی جائزہ لینے کی بجائے کچھ اشعار نقل

کیے جاتے ہیں،

مصاحب کردن عشق جنوں را دیوانہ شدن و سر به صحرای زدن

جنوں جو عشق کا سپہ دار اچھے ۛ عشق کوں دوسوا کر نہار اچھے
ہر ایک ہلٹ و ہنسی بیگانا ہے ۛ نڈر ہے، بلا ہے، دیوانا ہے ۛ
فلاطوں کے دل میں اگر جا کرے ۛ گنوا عقل اس کوں دیوانا کرے
دو عالم کے فکراں بھلاتا ہے ۛ جلا شہر جنگل دیکھاتا ہے ۛ
عقل پر دوس روز کھوڑا نہیں ۛ بغیر از جنوں عشق پورا نہیں
غم دنیوی کا وہ خون خوار ہے ۛ تکلف کے پیشے سوں بیزار ہے
جو عاشق ہر ت میں دیوانا اچھے ۛ مرے تو اگے دوچ دانا اچھے

جنوں نے جو اتنا کیا دھوم دھام ۛ عشق نے گنوا یا سگی نیک و نام
بدن پر کیا پیر بن چاک اودنے ۛ بچھونا کیا دامن خاک اودنے
حسن کے اندیشے میں مرنے لگا ۛ یہی ناؤں تسبیح کرنے لگا
اسی حال رسوا ہو عالم منے ۛ لیا حیرت آباد کی راہ اودنے
ہوا نا امید آہ مارن لگیا ۛ لے کر نام پیو کا پکارن لگیا
گلیاں میں وہ پھرنے لگا روز شب ۛ ہوے دیکھ اسے دوست دشمن عجب
کبھی لب کے تیں کھول کر تاگیاں ۛ پہنچتے تھے نالے کے تیر آسماں
کبھی زلف کی یاد سوں دود آہ ۛ نکالا ہے بولا مرے دن سیاہ
کبھی راگ کے تان بھرنے لگا ۛ کبھی شعر جاں سوز پڑھنے لگا
ہر یک راگ کیاں جنوں کا بیاں ۛ بھتر سوں کرے لھو کے چشمے روپاں

کہیں دو کھڑا چھکو گریاں دسا ۛ کہیں دیکھ حالت کوں اپنے ہنسا
اپس ہات و مشت کا دامن لیا ۛ جنگل بیچ جا کر ٹھکانا کیا

فرستادن حسن ترحم را و آمدن عشق بہ شہر و بہ حمام رفتن و منے نوشیدن

سنیادل کے بل سوں میں یوسدا ۛ پرت کا گلستاں ہے رنگین سدا
پرت کا بیان (میں) کہوں کس کنے ۛ کشش ہے وہ معشوق و عاشق منے
اگرچہ خدا سب پو قادر اچھے ۛ وفادار محبوب نادر اچھے
جسے نیک طالع بنایا ہے حق ۛ وفادار پیو اوس ملایا ہے حق
نامہ نوشتن عشق بہ حسن و جواب نامہ نوشتن حسن بہ عشق

ارے قاصد آشوق کا کر علاج ۛ کہ دھرتا ہوں تج سوں اتنا احتیاج
کتابت لیجا پیو کنے دمبدم ۛ شتابی ستے آ مبارک قدم
یو دکھنی کتابت کی زنجیر میں ۛ مضامین حرمان کی زنجیر میں
قلم کچھ عجائب گہر ریز ہے ۛ کہ صفے پو تیرے تمن تیز ہے
دوات انجودوں کا تو چشم ماں ہوا ۛ کہ ظلمات کا دو کر شماں ہوا
اتنا سبز ہوتا بچن لب منے ۛ معانے کا ریشا مرکب منے

رقمہ خواستگاری نوشتن بہ عصمت بی بی مادر حسن

جو عاشق وصل کا ہے امیدوار ۛ اس آگے بلا ہے بڑی انتظار
ہر یک تل اس عالم میں یک سال ہے ۛ کہ حسرت سوں دل کا برا حال ہے
خصوصاً جو قاصد کوں بھیجا اچھے ۛ پھر آنے تلک کیا کلیجا اچھے

ولے خوش خبریے جو قاصد پھرے + تو شادی سوں غم کوں مبدل کرے

عروسی عشق و حسن و کیفیت عروسی

اگرچہ محبت ہے اول بلا + کر کرتی بلا یاں سوں دل مبتلا
دلوں میں جنوں کا سہو در سبو + ابجو کر نکالے جگر کا لہو
ولے عاقبت مہربانی کرے + خوشی دے کے دل کامرانی کرے

وجود العارفین

شاہ معظم شاعر ہی نہیں نثر نگار بھی تھے۔ اُن کے نثری رسالے شرح شکار نامہ کا ذکر ہو چکا ہے۔ اُن سے نثر کا ایک اور رسالہ بھی منسوب کیا جاتا ہے، جس کا نام وجود العارفین ہے، لیکن یہ انتساب مشتبہ ہے۔ اس لیے کہ اس رسالے کے بعض نسخوں پر علی پیر اور شاہ برہان الدین راز الہی کے نام بھی ملتے ہیں۔ ان سب نسخوں کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

۱۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ، حیدر آباد

مخطوط نمبر (۱۷۲) تصوف، تعداد صفحات (۴۰)۔

یہ نسخہ شاہ معظم کی منظومات شجرۃ الاتقیاء، گلزارِ چشت اور آزاد نامہ وغیرہ کے ساتھ ایک ہی جلد میں تھا، لیکن اب ان تمام رسالوں کی علاحدہ جلد بندی کر دی گئی ہے۔ یہ تمام رسالے دیسی کاغذ پر خط ثلث میں لکھے ہوئے ہیں۔ زیر نظر نسخے کی لوح پر کوئی عبارت ہے اور نہ ترقیمہ ہی ہے، جس سے مصنف کا پتا چلتا۔ ہاشمی مرحوم نے مصنف کا نام معظم بتایا ہے۔ لے لیکن کوئی شہادت ایسی نہیں ملتی جس سے اس انتساب کی توثیق ہو سکے، سوائے اس کے کہ یہ رسالہ شاہ معظم کی منظومات کے ساتھ

QASID KITAB GHAR

Mohammad Hanif Razvi Nagarchi
Near Jamia Masjid, Arcot Dargah,
BIJAPUR-586104, (Karnataka)

جلد تھا اور ان سب کا کاتب ایک ہی ہے۔ کاتب نے اپنا نام اور کتابت کے مکمل ہونے کی تاریخ و دن، وقت اور مہینہ گلزارِ چشت کے خاتمے پر لکھا ہے۔ سنہ نہیں لکھا ہے :

تمت تمام سند تحریر فی التاريخ نهم ماہ ربيع الآخر در ربيع الآخر المذرج
(جمہ) وقتِ دہ ہمار (دو ہجر) انصرام رسید از خطِ خام سید جعفر
باشیہان۔

رسالے کے آغاز سے پہلے کے صفحے پر متن کے قلم سے مختلف قلم سے میں دعویٰ رسالہ آنت لکھا ہے۔ بسم اللہ سے پہلے ایک ہرے جو صاف نہیں ہے، تاہم سید محمد جعفر حسینی پڑھا جاتا ہے۔

آغاز :

اے عارفِ خداے تعالیٰ قرآن میں فرمایا ہے کہ کل شیء فی محیط و فی انفسک
افلا تبصرون وهو معکم اینا کنتم نحن اقرب الیہ من جبل الوریثہ۔
فلما توبوا لوفیہ وجہ اللہ فی ہذہ اعمی وھو فی الآخرۃ اعمی و انزل
سبیلہ۔ اس واسطے ضرور ہوا کہ کچھ معرفت حق کا بولنا، جو اس کو سمجھا گیا
تیوں۔ قال علیہ السلام تکلم الناس علی قدر عقولہم۔ یعنی ادبی بات
کرتا ہے اپنی عقل موافق۔

وجود العارفین ہے (ناؤں) ادب کا

وہی پاوے نصیب ہو خوب جس کا

جو کوئی پیر کامل سوں یہ دیکھے

علی ادس کا متاع ہے نہیں ہے کس کا

خاتمہ :

باتاں تے کچھ کاج نہیں اسے کرنی کچھ یک سار
کرنی تے کچھ چھل نہیں بن لوڑے سو جن ہمار
جب لگ دیا فرست الہی نہ غفلت گھال یسار
انصاف باقی شاہد جو نابندہ فعل مختار
تمت تمام شد

۲۔ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد

مخطوطہ نمبر (۱۱۱۸)، تعداد صفحات (۲۴)

لوح پر رسالہ وجود العارفین من تصنیف حضرت خواجہ بھور انوار حضرت علی پیر صاحب
لکھا ہے۔ ڈاکٹر زور نے بھی مصنف کا نام علی پیر ہی بتایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ رسالے
کا نام وجود العارفین، حضرت بندہ نواز کے رسالے وجود العاشقین کی تقلید میں رکھا ہے
کوئی ترقیہ نہیں ہے۔

۳۔ کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد

مخطوطہ نمبر (۳۵، تصوف)، تعداد صفحات (۹)

یہ نسخہ ناقص الاول و ناقص الآخر ہے۔ آغاز اس طرح ہوتا ہے :

آدمی سین بات کرو ادس کے عقل موافق : رباعی (قطعہ)

وجود العارفین ہے ناؤ اس کا : وہی پاوے نصیب ہے خوب جس کا

جو کوئی پیر کامل سوں یہ دیکھے : علی ادس کا متاع ہے نہیں بھی کس کا

افتخام کی عبارت یہ ہے۔

مرنے کے آگے مرنا تو دو کیوں مرنا، یعنی اس پانچ حواس کے لذتوں میں
گزرنا تو جانوریت میں اس تے چھوٹا

ہاشمی مرحوم نے مصنف کا نام علی پیر لکھا ہے اور سہ تصنیف کسی حوالے کے بغیر
۱۲۵ھ ہجری بتایا ہے۔

۴۔ کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد

مخطوط نمبر (۴۵ شاملات)، تعداد صفحات (۹)

لوح پر کوئی عبارت نہیں ہے، البتہ ترقیمے میں مصنف اور رسالے کا نام لکھا ہے:
ایں رسالہ وجود العارفین من تصنیف حضرت پیر صاحب علی۔ کاتب الحروف
غلامان غلام خاک پاسے درویشاں شاہ نظر علی بیگانی القادری شطاری
تمت تمام شد۔

ہاشمی مرحوم نے اس نسخے کے تعارف میں لکھا ہے:

اس نام کی فارسی کتاب ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے۔ کتب خانہ
سالار جنگ میں اسی نام کی کتاب معظم کی مصنفہ ہے۔

رسالے کا نام ترجمہ وجود العارفین، مصنف کا نام علی پیر اور سہ تصنیف

اوائل ستائیسہ ہجری بتایا ہے۔

۵۔ کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد

مخطوط نمبر (۸۱۷ تصوف)، تعداد صفحات (۳۰)

لوح پر رسالہ وجود تصنیف شاہ برہان الدین قادری ۱۶۹۵ھ نشان سلسلہ فرست

۱۔ فهرست مخطوطات کتب خانہ آصفیہ، جلد دوم، صفحہ ۲۰۷

۲۔ فهرست مخطوطات کتب خانہ آصفیہ، جلد دوم، صفحہ ۲۵۳

۳۔ فهرست مخطوطات کتب خانہ آصفیہ، جلد دوم، صفحہ ۲۵۳

حکیم محب حسین لکھا ہے، لیکن یہ تحریر متن کے قلم سے مختلف اور بہت بعد کی ہے۔
ترقیمہ حسب ذیل ہے:

۱۔ ایں رسالہ وجود تصنیف جناب حضرت سید شاہ برہان الدین قادری

راز الہی۔ این فوشت محمود خاں۔

ترقیمہ بھی متن کے قلم سے مختلف ہے لیکن لوح کی عبارت سے پرانا معلوم ہوتا ہے

اس نسخے میں بھی وہ قطعہ موجود ہے، جس میں رسالے کا نام وجود العارفین اور علی

تخلص آیا ہے۔ ہاشمی صاحب نے مصنف کا نام شاہ برہان الدین قادری راز الہی لکھا

ہے اور سہ تصنیف قبل ستائیسہ ہجری بتایا ہے۔

اس نسخے کا خاتمہ مذکورہ بالا نسخوں سے مختلف ہے:

اپنے میں رہ کر سلوک تے یک لحظہ بھی خالی ناربنا۔ خلوت در انجمن سو جو

مجلس میں لوگاں کے ساتھ مل بیٹھ کر یاد کرتے رہنا اور خدا کی یاد نہ بھولنا،

پس تنگ نفس، دل جاتا، روح دیکھتا۔ تمام شد۔

تمت تمام شد کے باوجود یہ نسخہ ناقص الآخر ہے اور آخری دو صفحات کی عبارت

کسی اور رسالے کی معلوم ہوتی ہے۔

۶۔ کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد

مخطوط نمبر (۱۸۶۷ تصوف)، تعداد صفحات (۱۴)

یہ نسخہ ایک اور رسالے کے ساتھ شامل ہے، جس کا نام جام جہاں نا ہے۔

ابتدائی صفحے کی لوح پر جام جہاں نا لکھا ہے، لیکن اس عنوان کے تحت جو رسالہ نقل

کیا گیا ہے وہ وجود العارفین ہے۔ ترقیمے میں رسالے کا نام رسالہ واجب الوجود بتایا گیا

ہے۔ اس رسالے کے خاتمے پر صابر کا کلام، ایک دائرہ اور پھر حافظ اور صابر کا کلام ہے۔

۷۔ فقیر الدین ہاشمی، فهرست مخطوطات کتب خانہ آصفیہ، جلد دوم، صفحہ ۲۱۲

اگلے صفحے پر ایک دائرہ اور اصطلاحات کی تشریح ہے، جس کے بعد نے مصنف سے ایک رسالہ شروع ہوتا ہے۔ غالباً یہ جام جہاں ناک ہے
اس نسخے پر مصنف کا نام درج نہیں ہے، اس لیے ہاشمی مرحوم نے مصنف نامعلوم لکھا ہے۔

ترجمہ حسب ذیل ہے:

یہ رسالہ واجب الوجود کا دسویں تاریخ ربیع الاول سنہ ۱۲۶۱ ہجری ہاتھ سے
احقر قاسم خاں کے تمام ہوا۔

خاتمے پر باجن کا ایک شعر درج ہے:

کہنے میں تو بھادوں نا اڑے جس کا سو ہے جانے

باجن چاکے جس کا چکا چاکا ہوئے سو جانے

۹۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

مخطوط نمبر (۵۲ تصوف)

یہ نسخہ اس مجموعے میں شامل ہے، جس میں شاہ تراب کی گیان سرودپ،

من سمعادون، کلام بادشاہ حسینی وغیرہ نقل کیے گئے ہیں۔ اس نسخے میں علی تخلص

والا قطعہ نہیں ہے۔ لوح پر رسالے کا نام وجود یہ لکھا ہے۔ مصنف کا نام کہیں درج

نہیں ہے

۱۰۔ نسخہ ملوکہ عبد اللہ صاحب مرحوم

ہاشمی مرحوم نے دکن میں اردو میں حضرت امین کی نثری تصانیف کے خاتمے پر

لکھا ہے:

اسی عہد کے دو اور رسالوں کا پتہ چلا ہے جو نثر میں لکھے گئے ہیں، لیکن ان کے

مصنف کا نام معلوم نہیں ہوتا مگر مخطوطے کی اندرونی شہادتوں سے پتا چلتا
ہے کہ یہ اسی زمانے کی تالیف ہے۔

ان میں سے ایک رسالے کا جو نمونہ انہوں نے اپنے چچو یا عبد اللہ صاحب مرحوم
کی ملوکہ بیاض سے نقل کیا ہے وہ وجود العارفین ہی کا ابتدائی حصہ ہے۔ یہ نسخہ راقم الحروف
کو دست یاب ہو سکا۔ ہاشمی مرحوم کا بیان تھا کہ عبد اللہ صاحب کے انتقال کے بعد یہ
نسخہ کہیں گم ہو گیا ہے۔

۹۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، پاکستان

تعداد صفحات (۱۵۱)، خط ثلث

آغاز:

اے عارف خداے تعالیٰ قرآن میں فرمایا ہے کہ کل شیء عجیب و افضل

عجیلا۔ اس واسطے ضرور ہوا کہ کچھ معرفت حق کا بولنا، جیوں ایس کوں۔

سمجھا گیا تیوں۔

اقتتام:

خانیما قولوا فاعوذ بجمہ اللہ

باتاں تے کچھ کاج نہیں رے کرنے کچھ یک سار

کرنے تے کچھ پہل نہیں بن لورے سر جمن ہار

جب لگ دیا فرست الہی غفلت کوں رکھلام ببار (کڑا)

انصاف باقی شاہد ہونا بندہ فعل مختار

تمت تمام شد کار بن نظام شد

وہ قطعہ بھی موجود ہے جس میں علی ہاشمی ملوکہ خاں اور رسالے کا نام وجود العارفین

افسر صدیقی نے اپنے مضمون "سی حرفی معظم" مطبوعہ رسالہ اردو، کراچی، بابت اپنی ۶۶ء میں شاہ معظم کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کتب خانہ خاص مولوی عبدالحق میں وجود العارفین کا ایک نسخہ ہے، جس کی لوح پر "ایں وجود العارفین گفتار حضرت پیر دستگیر علی ابن حضرت شاہ بابا حسینی ابن شاہ امین الدین علی" درج ہے۔

کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں ایک رسالہ نمبر (۱۰۲۳) پر ہے جس کی لوح پر "وجود تصنیف علی صاحب ابن باواشا صاحب قدس سرہ" درج ہے۔ اس رسالے کی ابتدائی چند سطریں وجود العارفین ہی کی ہیں لیکن اس کے بعد پورا رسالہ مختلف ہے۔ آخر میں لکھا ہے "یہ تلاوت الوجود سالکان وعاشقان محبوب راتسلی نماید۔"

انشاء اللہ تعالیٰ تصنیف سید الفتح صدر الدین خواجہ خواجگان مخدوم سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز عاشق شہباز سرانوار خاک و بانیاں قدس سرہ۔

ڈاکٹر زور نے اسی عبارت کے پیش نظر لکھا ہے کہ "اس مخطوطے کی آخری عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا نام تلاوت الوجود ہے اور یہ غالباً بندہ نواز کے فارسی رسالے کا اردو ترجمہ ہے۔ اور اس رسالے کو تلاوت الوجود ہی کے نام سے متعارف کرایا ہے۔"

یہ دراصل تلاوت الوجود مصنفہ شاہ مخدوم حسینی مرید و خلیفہ پیر اللہ حسین کا ایک نسخہ ہے، جس کے آغاز میں کاتب نے وجود العارفین کی چند سطریں نقل کر دی ہیں۔ تلاوت الوجود کے اکثر کاتبوں کی طرح اس نسخے کے کاتب کو بھی شاہ مخدوم حسینی کے نام سے غلط فہمی ہوئی ہے اور اس نے اس رسالے کو بندہ نواز کی تصنیف خیال کر کے انھیں کا نام لکھ دیا ہے۔ حلال کہ متن میں شاہ مخدوم نے ایک جگہ اشعار میں اپنے پیر کا

ڈاکٹر رفیع سلطانہ نے وجود العارفین کے دو نسخوں کا ذکر اپنی کتاب اردو نثر کا آغاز و ارتقا میں کیا ہے اور دکن میں اردو کے حوالے سے اس کو حضرت امین کی ۱۱۴ء اور نسخہ نمبر (۸۱۴) تصوف، کتب خانہ اصفیہ کے حوالے سے شاہ برہان الدین راز الہی کی تصنیف بتایا ہے۔ مگر الذکر انتساب کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے، اس لیے کہ نسخہ نمبر (۸۱۴) تصوف، کتب خانہ اصفیہ پر راز الہی کا نام لکھا ہے لیکن اول الذکر انتساب کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے کہ ہاشمی مرحوم نے صراحتاً لکھا ہے کہ اس رسالے کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

زیر نظر رسالے کے (۱۰) نسخوں میں سے (۶) پر مصنف کا نام درج نہیں ہے، تین پر علی پیر کا اور ایک پر شاہ برہان الدین راز الہی کا نام ہے۔ جہاں تک شاہ برہان الدین راز الہی کے نام کا تعلق ہے، راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ نام کاتب نے نہیں لکھا ہے بلکہ بعد میں کسی نے بڑھا دیا ہے۔

راقم کی نظر سے اس رسالے کے سات نسخے گزرے ہیں۔ ان میں سولے انجمن کے نسخے کے ہر نسخے میں پانچ عناصر، پچیس گن کا ذکر ملتا ہے اور یہ حضرت امین کی تعلیمات ہیں۔ راز الہی خانوادہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے نظام تصوف میں پانچ عناصر پچیس گن کی تعلیمات کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ حضرت امین کے ہم عصر ضرور تھے اور ہم عصر ایک دوسرے سے متاثر بھی ہوتے ہیں لیکن ہمارے ہاں ایسا کوئی

ثبوت نہیں ہے، جس کی بنیاد پر کہا جاسکے کہ رازِ الہی حضرت تائین کے نظامِ تعقوف سے متاثر تھے۔

زیر نظر رسالے میں جگہ جگہ شاہ برہان کا نام آیا ہے اور ان کے اشعار سے استدلال کیا گیا ہے۔ یہ شاہ برہان الدین جانم کے اشعار ہیں۔ اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ اگر کتاب نے لوح اور ترجمہ میں شاہ برہان الدین راز الہی کا نام لکھ دیا ہے تو اس نے یا کسی پڑھنے والے نے نام کا اضافہ کر دیا ہے تو اس نے شاہ برہان الدین جانم کو شاہ برہان الدین راز الہی سمجھا اور انھیں سے رسالے کو منسوب کر دیا۔

اب یہ سوال حل طلب رہ جاتا ہے کہ اس رسالے کا مصنف شاہ معظم اور علی پیر میں سے کون ہے۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ کا وہ مجموعہ رماں جس میں وجود العارفین شامل ہے، قدیم ہے اور اس میں صرف شاہ معظم کے رسالے ہیں، اس لیے قیاس کہتا ہے کہ شاہ معظم کے خاندان یا سلسلے ہی کے کسی فرد نے اپنے بزرگ سلسلہ کے رسائل کو محفوظ کرنے کی غرض سے یہ مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اس لیے ایک ایسے مجموعے میں کسی اور مصنف کے رسالے کو شامل کرنے کا یہ ظاہر کوئی قرینہ نہیں معلوم ہوتا۔

وجود العارفین شاہ معظم ہی کی تصنیف ہوگی اس لیے اس کو گلزارِ چشت، شجرۃ الاتقیاء، آزاد نامہ وغیرہ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، لیکن اس قیاس کو وہ قطعاً کم زور کر دیتا ہے جس میں علی تخلص ہے۔ اس بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اصل رسالہ فارسی میں ہوگا، جس کا شاہ معظم نے دکنی میں ترجمہ کیا اور متن کے ساتھ علی پیر نے جو قطعہ فارسی میں کہا تھا اس کا بھی ترجمہ کر دیا۔ اور علی پیر کے تخلص کو اسی طرح برقرار رکھا۔ چون کہ اصل رسالے (فارسی) کے مصنف علی پیر ہیں، اس لیے دکنی ترجمے کے نسخوں پر بھی انھیں کا نام لکھ دیا گیا ہے۔ اس قیاس کے دو اسباب ہیں۔

(۱) نسخہ نمبر ۳۵ مشائخ کتب خانہ آصفیہ کو ترجمہ وجود العارفین

بتایا ہے۔

(۲) مولانا علاء الدین جنیدی سجادہ نشین رودہ شیخ گلبرگہ کا بیان ہے کہ ان کے ہاں علی پیر کی تصنیف وجود العارفین کا ایک فارسی نسخہ تھا جو کہیں گم ہو گیا۔ اگرچہ اہم الحروف کی نظر سے فارسی رسالہ نہیں گزرا، لیکن مولانا علاء الدین کا مجرد بیان بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی گنجائش نکل آتی ہے کہ علی پیر نے وجود العارفین کے نام سے ایک رسالہ فارسی میں تصنیف کیا تھا، جس کا ترجمہ شاہ معظم نے کیا ہوگا۔ لیکن یہ محض قیاس ہے، معظم کا نام کسی نسخے پر درج نہیں ہے، اس کے برخلاف علی پیر کا نام تین نسخوں پر لکھا ہوا ہے۔ پھر اس قطعے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جس میں رسالہ کا نام اور مصنف یعنی علی پیر کا تخلص (علی) موجود ہے۔ یہ ایک ایسی قوی داخلی شہادت ہے جس کی بنیاد پر علی پیر ہی اس رسالے کے مصنف قرار پاتے ہیں۔

زیر نظر رسالے کے کسی نسخے پر اس کا نام ترجمہ وجود العارفین نہیں ملتا۔ پتا نہیں نسخہ نمبر ۳۵ تصوف شائعات کو ہاشمی صاحب نے کیوں ترجمہ وجود العارفین کا نام دیا ہے، جب کہ ترجمے میں اس کا نام صاف طور پر وجود العارفین لکھا ہے۔

اس رسالے میں مراتب وجود اور ان کے لوازم و شرائط کی توضیح و تشریح انتہائی جامع اور مرتب انداز میں کی گئی ہے اور اس ضمن میں جو نکات اور اصرار آگئے ہیں ان کو بھی سلیحے ہوئے دھنگ سے سمجھایا گیا ہے۔ یوں تو دکن میں تصوف کے موضوع پر سینکڑوں رسائل لکھے گئے لیکن زیرِ تبصرہ رسالہ شیخ محمود خوش دہاں کے رسالہ معرفت السلوک کے بعد ربط و تسلسل، ایجاز و اختصار، ترتیب و توازن اور جامعیت کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

معرفت السلوک یقیناً وجود العارفین کے مصنف کے پیش نظر ہی ہوگی، لیکن اس کو معرفت السلوک کا خلاصہ یا چرہ نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے کہ :

(۱) اس رسالے میں مراتب کے لوازم و شرائط کی جو تشریحات ملتی ہیں وہ بڑی حد تک حضرت امین کے رسالے سے ماخوذ معلوم ہوتی ہیں۔

(۲) مراتب کی تفصیل تو یہ ہے لیکن لوازم و شرائط کی ترتیب میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ معرفت السلوک میں ہر مرتبے کے لوازم کے بیان کا آغاز ممکن سے ہوتا ہے لیکن وجود العارفین (ابتداء) سے ہوتی ہے۔ حضرت امین کے ہاں بھی آغاز اسی طرح ہوتا ہے۔

معرفت السلوک میں مراتب کے لوازم و شرائط کے سلسلے میں ”پردہ“ کا ذکر نہیں ملتا۔ وجود العارفین میں ہر مرتبے کے ساتھ ایک پردے کو متعلق کیا گیا ہے۔

معرفت السلوک اور وجود العارفین میں لوازم اور شرائط کی ترتیب کا فرق حسب ذیل نقشے سے واضح ہوگا۔

۱۳	۱۲	۱۱	۱۰	۹	۸	۷	۶	۵	۴	۳	۲	۱	
۱۳	۱۲	۱۱	۱۰	۹	۸	۷	۶	۵	۴	۳	۲	۱	۱۳
۱۳	۱۲	۱۱	۱۰	۹	۸	۷	۶	۵	۴	۳	۲	۱	۱۳

معرفت السلوک اور وجود العارفین کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محمود خوش دہاں نے اپنے پیر کا سلوک بیان کیا ہے اور وجود العارفین کے مصنف نے سلوک برہانی کی اس بدلی ہوئی یا دوسرے الفاظ میں ترقی یافتہ شکل کو پیش کیا ہے، جو حضرت امین کے تعارف اور اجتہاد کے لیے مفاد و اہمیت میں رائج ہو گئی تھی۔ اگر وجود العارفین کے مصنف نے شیخ محمود خوش دہاں کی طرح تفصیل سے کام لیا ہوتا تو حضرت امین کے اجتہاد کے وہ تمام پہلو اجاگر ہو جاتے، جن کی تاویل و تشریح کے لیے کسی مستند ماخذ کی عدم موجودگی میں تحقیقی کام کرنے والے کو غیر معمولی دلی سوزی اور جگر کا دی گئی پڑتی ہے۔

سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ — حیات اور کارنامے کے بارے میں چند رائے

مولانا زین العابدین سجاد میرٹھی

..... مصنف نے اپنی پوری صلاحیت تحقیق و تنقید صرف کر دی ہے۔ چنانچہ حضرت امین کا نام مختلف سابق اور لاحق کے ساتھ (۵۳) کاغذ سے نقل کیا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت میراں جی کے نسب کے سلسلے میں اس بحث پر کہ وہ نسباً سید تھے یا غفل پوری دوا تحقیق دی گئی ہے۔ شاہ برہان الدین جامی کے سنہ وفات کے مسئلے پر بھی تحقیق کا حق ادا کیا گیا ہے۔

باب سوم میں حضرت امین اور ان کے خاندان کے نظام تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ نظام تصوف دوسرے خاندانوں کے نظام کے برخلاف ہندو فلسفے کی بنیاد پر قائم ہے۔ مصنف فاضل نے اس کی مخصوص اصطلاحات اور ان کے معانی اور مقایم کو بڑی خوبی سے نقشے کھینچ کھینچ کر واضح کیا ہے۔ حضرت امین نے اس سلسلے میں جو اجتہادات و مفردات کیے ان پر بھی روشنی ڈالی ہے اور حق یہ ہے کہ اس باب میں تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔

کتاب کا باب چہارم و پنجم حضرت امین علی اعلیٰ کی تصنیفات نظم و نثر پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں ہر ہر تصنیف کو موضوع فکر و بحث بنا کر اس پر سیر حاصل کی گئی ہے۔ اس کے خطوط یا مطبوعات جن جن کتب خانوں میں ملتے ہیں، ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ان نسخوں کے فروق و اختلافات کو واضح کیا گیا ہے۔ الحاقات اور اغلاط کو نشان دہی کی گئی ہے۔ جن رسائل کا اتسار یا مشتبه یا غلط قرار دیا ہے اس کے شواہد و

قرآن بیان کیے ہیں اور اس سلسلے میں بڑی دقیقہ سنجی و شرف نگاہی سے کام لیا ہے
پانچواں باب مطالعہ زبان پر مشتمل ہے۔ اس باب میں حضرت امین کی زبان کے تمام
پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور میراں جی شمس العشاق اور بہان الدین جامی کی زبان
سے اُس کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ نیز حضرت امین اور اُن کے خالوادے کی زبان کی صرفی و
نحوی خصوصیات کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے اور اس زمانے کے مروج روزمریوں، محاوروں
اور اصطلاحات کی فہرستیں درج کی گئی ہیں، جن سے دکنی اردو کی ترقی و وسعت اور ارتقا
کے مختلف مراحل نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

الخزینہ یہ کتاب ایک طرف سلسلہ نظامیہ چشتیہ کے ایک نامور بزرگ کے نظریات
سلوک و معرفت اور اُس کے طریقی دعوت و ارشاد پر روشنی ڈالتی ہے تو دوسری طرف اردو زبان کے
دکنی میں منزل بہ منزل نشوونما و ارتقا اور وہاں کے بزرگان دین کی، اس کی تاسیس و ترقی
میں اہم خدمات کی بھی منظر کشی کرتی ہے۔ یوں یہ تصوف و زبان دونوں سے دل چسپی رکھنے
والوں کے لیے نہ صرف مطالعے بلکہ حربہ جاں بنانے کی چیز ہے۔ ہم فاضل مصنف کی اس
محققانہ پیش کش کو اردو زبان کے لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ سمجھتے ہیں۔

(اسلام اور عصر جدید، اکتوبر ۱۹۷۵ء)

مولانا سید شاہ صبغتہ اللہ بختیاری

جناب ڈاکٹر سید شاہ حسینی (حسینی شاہد) نے بڑی جدوجہد کے بعد ایک ایسی
ضخیم و ضخیم کتاب لکھ ڈالی ہے، جو اردو زبان کے ادبی تاریخی لٹریچر میں اپنی نظیر نہیں رکھتی
پھر اس کے ذریعے تصوف اور اہل تصوف کی خالص اور بے لوث خدمت انجام دی ہے
(ادب اور تصوف) دونوں چیزوں کا ذوق رکھنے والوں کے لیے یہ ایک نادر تحفہ ہے۔

جناب شاہد صاحب کا اہل موضوع تو حضرت سید شاہ امین الدین حسینی چشتی
رحمۃ اللہ علیہ کی ادبی خدمات کا تفصیلی تذکرہ اور اس پر مفصل تبصرہ اور اس کی حقیقت کو

اُجاگر کرنا ہے مگر اس دور میں تصوف پر جو کچھ لکھا گیا ہے اور کہا گیا ہے اُس کا فنی جائزہ لینے
کے لئے ضروری تھا کہ تصوف کے اس خاص پہلو کو پیش نظر رکھا جائے، جس میں خصوصی تعوذ
اور انفرادی اجتہاد کو دخل تھا، اس لئے شاہد صاحب نے پوری شہادت دی اور تفصیل سے
شاہ امین الدین کے تصوف پر روشنی ڈالی ہے، تب کہیں جا کر ادبی اور لسانی خدمت کا بھی
صحیح اندازہ ہو سکا ہے۔

جناب شاہد صاحب نے اپنی کرد و کاوش اور سچی جمیل سے ادب اور تصوف دونوں
کی اعلیٰ خدمت انجام دی ہے، یہ ان کے خاندانی اور نفسیاتی مزاج سے ہم آہنگ ہے۔
(ان کا یہ کام) ادبیات کی دنیا میں غیر فانی کارنامہ ثابت ہوگا۔

(صغیر دیپور، اگست ۱۹۷۹ء)

پروفیسر محمد حسن

رسمی تحقیق سے آگے قدم بڑھا کر تصورات اور طرز ادا کے مطالعے سے نتیجے نکالنے
کی ابتداء ڈاکٹر حفیظ تہیل نے کی، جن کی کتاب "معراج العاشقین کا مصنف" اس اعتبار سے
سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اس طرز تحقیق و تنقید کو گویا بلوغت تک
پہنچا دیا۔

یہ مقالہ یوں تو چھ ابواب پر مشتمل ہے، لیکن ان چھ ابواب میں امین الدین علی اعلیٰ کے
کارناموں کی سبھی جہتوں کا احاطہ ہی نہیں کیا گیا ہے، بلکہ دکنی ادب کی ایک خاص منزل کی
تمام خصوصیات کو بھی اُجاگر کر دیا ہے، مثلاً، تصوف، نثر اور مطالعہ زبان کے ابواب
گویا مسئلے کے سبھی پہلوؤں پر حاوی ہیں۔

حالات زندگی اور خاندان پر جو باب لکھا گیا ہے، اُس سے مصنف کی بے پناہ
محنت اور تحقیقی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ دکنی ادب کے مشاہیر اور اُن کی تصانیف کے
بارے میں بہت سے مفروضات صرف اس باب ہی سے شکست ہو جاتے ہیں۔ آگے

کے البواب کے انکشافات تو اور بھی حیران کن اور مفید ہیں اور ادبی تاریخ میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تصوف پر ڈاکٹر حسینی شاہد کی بحث نہایت اہم اور دل چسپ ہے۔ اس قدر اہم کہ اس کی اہمیت تاریخ ساز ہے۔

پانچ عناصر اور پچیس گن والے تصوف کو ڈاکٹر حسینی شاہد نے شاہ امین الدین علیؒ کے تصوف کی خصوصیت قرار دیا ہے۔ اور چون کہ گیسو دراز ہندہ نواز سے منسوب رسالہ 'معراج العاشقین' میں بھی یہی فلسفہ پیش کیا گیا ہے، اس بنا پر اس رسالے کو انھوں نے ڈاکٹر حفیظ قنیل سے اتفاق کرتے ہوئے خاندان امینیہ کے ایک بزرگ کی تصنیف قرار دیا ہے۔ پانچ عناصر اور پچیس گن کا پورا فلسفہ بڑی خوبی اور وضاحت سے سمجھایا گیا ہے اور وہ اس پر صاف دلالت کرتا ہے کہ اس دور کا اسلامی تصوف، ہندو تصوف سے نہ صرف متاثر تھا بلکہ تہذیبی اختلاط کا جو عمل جاری تھا، اس کا مظہر بھی تھا اور وسیلہ بھی۔

ڈاکٹر حسینی شاہد کا ایک کارنامہ مطالعہ زبان والا باب ہے۔ اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ گجری کے اثر کی نشان دہی والا حصہ۔ اب تک گجری پر تفصیل اور وضاحت سے نہیں لکھا گیا۔ علی گڑھ تاریخ ادب میں بھی جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ سرسری اور سطحی ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد لائق مبارک باد ہیں کہ ان کی محنت اور دیدہ ریزی سے اردو ادب کی تاریخ کے ایک اہم دور پر روشنی پڑی اور ان کی کاوش نے ادبی تاریخ میں اہم اضافے کا درجہ پایا۔

(عصری ادب : ۱۹-۲۰، ۱۹۷۵ء)

ڈاکٹر خلیق انجم

ہمیں حسینی شاہد کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے اعلیٰ کو اپنا موضوع تحقیق بنا کر تاریخ ادب اردو میں ایک مستقل باب کا اس طرح اضافہ کیا ہے کہ اب کوئی مورخ یا نقاد اعلیٰ کی ادبی فتوحات سے سرسری نہیں گزر سکتا۔

امین الدین علی اعلیٰ جیسے صاحب کمال اور صاحب علم بزرگ کے سنہ ولادت اور سنہ وفات کا بھی تک تعین نہیں ہوا تھا۔ یہ کام شاہد صاحب نے کیا ہے۔

شاہد صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اعلیٰ کی تمام تصانیف کے ان خطوط کی نشان دہی کی ہے جو مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔

یہ کتاب صرف اس موضوع پر ہی نہیں بلکہ کوئی ادب پر شائع ہونے والی تمام کتابوں میں مرغبرست ہے شاہد صاحب نے بے شمار قلمی اور مطبوعہ کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی جانفشانی اور دیدہ ریزی نے کوئی ادب میں ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔

(ہماری زبان : یکم فروری ۱۹۷۵ء)

ڈاکٹر زاج بہادر گورڈ

بڑی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنے پیش رو محققین کے کاموں سے جی کھول کر استفادہ کیا ہے، لیکن انھیں خوب پرکھا ہے۔ تحقیق کی کسوٹی پر کسا ہے، عیب میں آکر انھیں غلطیوں سمیت قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔ یہ علی تجسس، تحقیق پاکیزگی اور ادبی دیانت داری کا تقاضا تھا، جسے پورا کیا ہے، کسی پرانے بت توڑے میں، نئی حقیقتوں کی روشنی میں، جو حسینی شاہد کی تحقیق اور جستجو سے بے نقاب ہوئی ہیں، ان کے پیش روؤں کے اخذ کئے ہوئے کئی تنازع غلط ثابت ہوئے ہیں اور اسے انھوں نے بڑی جرأت سے بیان کیا ہے۔

غرض ۶ سو صفحات کا یہ مقالہ ڈاکٹر حسینی شاہد کا ایک زبردست کارنامہ ہے۔ انھوں نے ہماری تاریخ کے ایک درخشاں اور اردو کے کوئی ادب کے ایک عظیم الشان ورثے کو کاغذی پیرہن دے کر زندہ جاوید کر دیا۔

(سیاست : یکم جولائی ۱۹۷۴ء)

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۹	مفتاح الاسرار	مفتاح الاسرار
۷	۱۲	بعضوں کے بنائے متناقص اور متعارف ہیں۔ بعضوں کے بنائے متناقص اور متعارف ہیں۔	بعضوں کے بنائے متناقص اور متعارف ہیں۔ بعضوں کے بنائے متناقص اور متعارف ہیں۔
۸	۱۳	قرآن	قرآن
۱۲	۱۵	اس عہد آفریں	اس عہد آفریں
۱۸	۶	کنہ	کنہ
۱۹	۵	نبیوں	نبیوں
۲۲	۱۰	کدہیں	کدہیں
۲۲	۱۱	جب ہولا	جب ہولا
۲۳	۱	جس سے جان ذات اور جس سے عزان ذات	جس سے جان ذات اور جس سے عزان ذات
۲۳	۴	رماں حق	رماں حق
۲۹	۱۷	الشہادت	الشہادت
۳۲	۶	ان کی	ان کی
۳۲	۷	قصا	قصا
۳۲	۷	مشورہ ہے	مشورہ ہے
۳۹	۴	لے	لے
۳۹	۳۹	سات حرف	سات حرف
۴۱	۴	سات حرف	سات حرف
۴۲	۲۱	سات حرف	سات حرف
۴۳	۲۱	سات حرف	سات حرف
۴۵	۴	سات حرف	سات حرف
۴۹	۵	سات حرف	سات حرف
۵۰	۵	سات حرف	سات حرف
۵۱	۱۴	سات حرف	سات حرف
۵۲	۱۴	سات حرف	سات حرف
۵۳	۵۳	سات حرف	سات حرف
۵۴	۹	سات حرف	سات حرف
۵۵	۱۵	سات حرف	سات حرف
۵۶	۱۶	سات حرف	سات حرف
۵۷	۱۳	سات حرف	سات حرف
۶۰	۶	سات حرف	سات حرف

QASID KITAB GHAR
Mohammad Hanif Razvi Nagarchi
Near Jamia Masjid, Arcot Dargah,
BIJAPUR-586104, (Karnataka)

بیجاپور کا ایک صوفی شاعر

شادِ مرعظم



ڈاکٹر حسینی شاہد



انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش

QASID KITAB GHAR
Mohammad Hanif Razvi Nagarchi
Near Jamia Masjid, Arcot Dargah,
BIJAPUR-586104, (Karnataka)

حیدرآباد

دیکھ، صرف تفصیل سے متعارف تھے۔

شاہ معظم کے کلام کے تفصیلی مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ معظم اُن کا لقب ہے اور عطا کے پیر۔

خود قادر پیار کیا ہے : مجھ رویت آپ دیا ہے
عجرا کھا ناؤں معظم : اور اپنا کیتا محرم
(مفتاح الاسرار)

میرا معظم ناؤں رکھ، عالم پویوں ظاہر کیا
قادر بڑا داتا رہے پھر کیا کرے گا دیکھنا
(دیوان)

قادر ہے نام شہ کا، کیا اسم ہے مسی
کر مجھ کو بیچ ہزاری معظم دیا لقب

(دیوان)

کہیں کہیں وہ اپنے آپ کو سلطان معظم بھی کہتے ہیں :

یونامہ کیا کر مجھے حق دیا : مجھ عاجز کو سلطان معظم کیا
(معراج نامہ)

اپ تاج فقر کا دیتا : اور سلطان معظم کیتا
(مفتاح الاسرار)

غالباً ان کا پورا لقب سلطان معظم ہے۔

شاہ معظم کی شرح شکار نامہ کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ ان کا نام محمد حسینی ہے، وہ قادری تھے، چشتیہ گھرانے

میں طالب ہوئے اور حضرت امین کے تربیت یافتہ تھے۔

اس شکار نامے کی شرح فقیر محمد حسینی معظم قادری اپنے حوصلے موافق فرما
ہیں، اس واسطے کہ یہ عاجز اس گھر چشت میں طالب ہوا ہے، ہور
امین الدین علی خود کوں سجدہ کیا ہے، اون کے تصدق سوں یو فقیر اس راز
کوں پونچا ہے یہ

اپنی نسبت قادریہ کی طرف انھوں نے گلزار چشت میں بھی اشارہ کیا ہے :
معظم کتے قادری ہے فقیر : گناہ گار، عاجز، فقیر و حقیر

لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ خانوادہ قادریہ میں وہ کس سے بیعت تھے۔ اس بارے میں : تو
خود انھوں نے کچھ کہا ہے اور نہ کوئی داخلی یا خارجی شہادت ہی ایسی ملی ہے جس کی
بنیاد پر ہم کوئی رائے قائم کر سکیں۔ البتہ چشتیہ گھرانے میں بیعت اور اپنے پیسہ اور
دارا پیر کا ذکر واضح الفاظ میں کی جگہ گیا ہے، لیکن اس کے باوجود اہل تحقیق کے بیانات
میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعضوں نے انھیں حضرت امین الدین علی اعلیٰ کے کا اور بعضوں
نے حضرت امین کے خلیفہ حضرت عبدالقادر لنگ بندہ کے (قادر لنگا) کا مرید مر شاگرد
بتایا ہے۔ بعضوں کے بیانات متناقض اور متضاد ہیں یہ

۱۔ مخطوط نمبر (۲۱۱۴) جدید کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد

۲۔ ڈاکٹر رفیع سلطانہ، اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء، ص ۱۹۲۔ ابو الفخر خالیدی، قدیم لہندہ جداول و مؤرخ ۲۲۲

۳۔ سخاوت ہرزا، تاریخ ادب اردو، جلد اول، صفحہ ۴۲۸

۴۔ ڈاکٹر زور فرست مخطوطات ادارہ ادبیات اردو، جلد اول، صفحہ ۱۳۸ اور صفحہ ۲۶۵، دکنی ناشر

۵۔ کی تاریخ، صفحہ ۶۰

نہر الدین شمس، کتب خانہ نواب شاہ جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحت فرست صفحہ ۱۹۹،

اردو صفحہ ۳۸۸، فرست مخطوطات کتب خانہ آصفیہ، جلد دوم، صفحہ ۲۹۰۔ دکن میں اردو

چشمی اشاعت، صفحہ ۲۶۹، علی گڑھ تاریخ ادب اردو صفحہ ۳۲۱